Regd. L. No.7243
Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1976

اس پرچہ میں

پرویز صاحب کا بصیرت افروز خطاب

جہاں مارکس ناکام رہ گیا

(اس سے آگے)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ــــ ۱۸ روپے غیر ممالک ــــ ۲ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ لاہور	۱½ ڈیڑھ روپیہ
جلد ۲۹	جنوری ۱۹۷۶ء	شمارہ ۱

فہرست

۱- لمعات ۲

۲- نقد و نظر ... (۱) داستانِ پاکستان (۲) تذکرۂ مصنفین درسِ نظامی ۸

۳- حقائق و عبر ..... (۱) عمر ضائع ہو گئی - (۲) ترکِ قرآن - (۳) اپنے گھر کی خبر لیجئے - (۴) ذرا کھل کر بات کیجئے - (۵) دین میں مفاہمت ۱۶

۴- جہاں مارکس ناکام رہ گیا - (اس سے آگے) .... (پرویز صاحب کا کنونشن ۱۹۷۵ء میں خطاب) ... ۴۵

۵- باب المراسلات .... (۱) ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں - (۲) مسلمان لڑکیوں کی غیر مسلموں سے شادی - ۶۱

ایڈیٹر محمد طفیل ناشر سراج الحق - مقامِ اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

از مکافاتِ عمل غافل مشو

مؤقر جریدہ نوائے وقت (لاہور) بابت ۶ دسمبر ۱۹۷۵ء میں حسبِ ذیل واقعہ (بلکہ وقوعہ) اشاعت پذیر ہوا ہے:-

ملتان ۵ دسمبر (نمائندہ خصوصی) آج پیپلز پارٹی کے ورکروں نے سابق وزیراعلیٰ پنجاب اور سینیٹر مسٹر حنیف رامے اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف ملتان کے ہوائی اڈے پر شدید مظاہرہ کیا۔ مسٹر حنیف رامے کو ہوائی اڈے سے باہر نہیں نکلنے دیا گیا جبکہ ان کے دستِ راست سابق وزیر خوراک و رکن صوبائی اسمبلی مسٹر ایم کے خاکوانی پر گندے انڈوں اور ٹماٹروں کی شدید بارش کی گئی، انہیں زدوکوب کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے مسٹر خاکوانی کو دبوچ لیا اور انہیں اس وقت چھوڑا جب انہوں نے ایک سادہ کاغذ پر لکھے ہوئے استعفےٰ پر دستخط کئے۔ مسٹر رامے طیارے سے جونہی باہر آئے۔ پیپلز پارٹی ملتان شہر کے صدر مسٹر ایم اے گوہر، جنرل سیکرٹری اور ملک منتظر مہدی کی قیادت میں جنگلے کے قریب کھڑے ہوئے پیپلز پارٹی کے ورکروں نے ہوائی اڈے کے رن وے پر انڈے اور ٹماٹر پھینکنے شروع کر دیئے مسٹر رامے اور ان کے ساتھی کچھ دیر جہاز کے ساتھ ہی کھڑے رہے۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے ورکر جنگلے سے باہر کھڑے رہے، پنجاب کے غدار، اسمبلی سے استعفےٰ دو کے نعرے لگاتے رہے، اور کچھ پتھر بھی پھینکے گئے۔ اس عرصے میں فیڈرل سیکورٹی فورس نے ہوائی اڈے کے جنگلے کے اندر پہنچ کر حفاظتی تدابیر شروع کر دیں۔ مسٹر حنیف رامے پندرہ بیس منٹ کے بعد پی آئی اے کے اسٹیشن منیجر کے دفتر میں چلے گئے، جبکہ ہوائی اڈے کے باہر پورے جنگلے کو پیپلز پارٹی کے ورکروں نے گھیرے میں لے لیا، جب مسٹر حنیف رامے کو باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے اسی طیارے سے اپنی نشست بک کرائی اور واپس لاہور چلے گئے۔

رامے صاحب نے خود ایک پریس کانفرنس میں اس پر واویلا کیا ہے۔

یہ سانحہ جس قدر تاسف انگیز ہے، اس سے کہیں زیادہ عبرت آموز ہے۔ عبرت آموز اس لئے کہ ان حضرات کے ساتھ جو کچھ ملتان میں پیش آیا، یہ اُن لوگوں سے ہوا جن کے ہاتھوں سے، خود یہ حضرات، ابھی کل تک یہی کچھ (بلکہ اس سے بھی زیادہ) اپنے مخالفین کے ساتھ کرایا کرتے، اور اپنی اس "کامیابی" پر فخر کیا کرتے تھے۔ حالانکہ خدا کا قانونِ مکافات انہیں پکار پکار کر کہا کرتا تھا کہ ؏

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

وہ کہتا تھا کہ اس قسم کے ہتھکنڈے مت اختیار کرو۔ یاد رکھو! وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ۔ (۳۵/۴۳) تخریبی اور شرانگیز تدابیر، پلٹ کر انہی کی طرف آ جایا کرتی ہیں جو انہیں اختیار کرتے ہیں۔ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ (۴۸/۶) دھاندلی ایک دائرۃ السوء (VICIOUS CIRCLE) کی شکل اختیار کر لیا، اور (باری باری) سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔

لیکن نشۂ اقتدار کی بدمستی میں، فطرت کی ان تنذیروں اور قانونِ مکافاتِ عمل کی ان پکاروں کو کون سنا کرتا ہے؛ انہوں نے انہیں اَن سُنی کر دیا۔ لیکن اَن سنی کر دینے سے خدا کا قانون منسوخ تھوڑا ہو جاتا ہے۔ اس نے جہاں کہا تھا کہ "مکرالسیّئ" خود تخریب کاروں کی طرف پلٹ آیا کرتا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ دیا تھا کہ یہ خدا کا قانون ہے۔ سنت اللہ ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ۔ (۳۵/۴۳) اور سنتِ اللہ کا تبدیل ہو جانا تو ایک طرف، وہ اپنا رُخ بھی نہیں بدلا کرتی۔ سیدھی ان تخریب کاروں کی طرف آ جایا کرتی ہے۔

طلوعِ اسلام کا فریضہ قرآنی آواز کا بلند کرنا ہے۔ جہاں تک غلط کوشوں اور تخریب کاروں کا تعلق ہے، قرآن مجید اُن لوگوں کو جو اس کی آواز بلند کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیں، حکم دیتا ہے کہ وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ۔ (۶/۷۰) تم انہیں قانونِ مکافاتِ عمل کی یاددہانی کراتے جاؤ، تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اس لئے تباہی کے جہنم میں جا گرے کہ اسے اس قانون کا علم نہیں تھا۔ طلوعِ اسلام اس ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں، انہیں مسلسل اور متواتر اس کی یاددہانی کراتا رہا۔ (مثلاً) پیپلز پارٹی اوائل ۱۹۷۲ء میں برسرِاقتدار آئی تھی، اور طلوعِ اسلام نے اپنی جولائی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ سپردِقلم کیا تھا، جس کا عنوان تھا —— اللہ دین کا جن ——۔ جن قارئین کے پاس طلوعِ اسلام کے فائل ہیں وہ اس مقالہ کا از سرِنو مطالعہ فرمائیں۔ دیگر حضرات کے لئے ہم اس کا پہلا حصہ درج ذیل کرتے ہیں۔ ہم نے اس میں لکھا تھا:۔

"پرویز صاحب نے، طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں، اپنے ایک خطاب میں، جس کا عنوان تھا —— "قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے، ہنگاموں سے نہیں" —— کہا تھا۔

وہ تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں عقل و فکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں، انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارات کو تباہ کرکے رکھ دیا۔ اس سیلاب

بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں بھی نہ کر سکیں، جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ اس لئے مملکتِ پاکستان، جو ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے، اس کا کیا مقابلہ کر سکے گی۔ جب ۱۹۶۸-۶۹ء کے ہنگامے پورے زوروں پر تھے تو میں نے، ان آتش برداروں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ ان کو قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون شکنی دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب ہیجانے اس کا شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں گاندھی نے (QUIT INDIA) کی تحریک شروع کی اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بیباک چھوڑ دیا تو اس نے قائداعظمؒ کو بھی دعوت دی تھی کہ جب، انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے۔ یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اس کے جواب میں قائداعظم نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کا احترام سکھائیے، قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے۔ ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو آج جس سیلاب کا رُخ انگریز کی طرف ہے، کل کو اُس کا رخ خود آپ کی سمت ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں بھی نہیں رہے گا۔ یہی کچھ میں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اُس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے اُبھار رہے اور اس کے اس عفریتی رقصِ آتشیں پر جشنِ مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ الہ دین کے چراغ کے اس جنّ کو بوتل سے نہ نکالیئے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اُسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہو گی۔ لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخورِ اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی قانون شکنی کے خوگر عناصر، ان کے خلاف اُٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے ہیں اور حکومت سے فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے۔ لیکن اب انہیں کون روک سکتا ہے۔!

جو آگ لگائی تھی تم نے اُس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم بھگت رہی ہے۔ اس وقت پورا معاشرہ لاقانونیت (LAWLESSNESS) کی زد میں آ رہا ہے۔

"اس کے بعد بھی وہ اپنی اس پکار کو برابر دہراتے رہے۔ لیکن کسی نے اس فغانِ جگر پاش کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ہر ایک نے اپنے اپنے جنّ بوتلوں سے نکالنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ اب کیفیت یہ ہے کہ یہ بدنصیب ملک انہی جنّات کی وحشت سامانیوں اور خرمن سوزیوں کی آماجگاہ بن چکا ہے، اور جس آگ سے یہ کھیل رہے ہیں اس کی شعلہ انگیزیاں دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ہر صبح جو اخبار آتا ہے اس میں شہ سرخیوں

سے، ان کی پیدا کردہ تباہیوں اور بربادیوں کی خبریں آتشیں حروف میں لکھی ملتی ہیں، ایک تو ہم، ان خبروں کے عادی سے ہو گئے ہیں، اور دوسرے اخبارات کی اثرانگیزی کی عمر صرف ایک دن ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں مجموعی طور پر اندازہ نہیں ہوتا کہ ہماری تباہیاں کس حد تک بڑھ چکی ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے گذشتہ آٹھ دس دنوں کے دو تین اخبارات ہیں۔ آیئے ہم آپ کو بتائیں کہ ان میں "جنّات" کی فسادانگیزیوں اور خون ریزیوں کی کس کس قسم کی خبریں ملتی ہیں۔"

اس کے بعد ہم نے تفصیل سے بتایا تھا کہ ملک میں کس کس قسم کی ہنگامہ خیزیوں اور فسادانگیزیوں کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اور اربابِ اقتدار کو ان کے ازالہ کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔"

یہ جولائی ۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ اس کے بعد ہم مسلسل (وقتاً فوقتاً) اس موضوع پر لکھتے رہے اور ان سے کہتے رہے کہ اگر آپ کو اس کا احساس نہیں کہ لاقانونیت سے ملک کی بنیادیں کس قدر متزلزل ہو رہی ہیں، تو کم از کم اتنا ہی سوچیئے کہ خود آپ کو اس کا کس قدر سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا؛ لیکن یہ اپنی تخریب کاریوں میں آگے ہی بڑھتے گئے۔ تاآنکہ "خدا کا عذاب" ان پر ان راہوں سے آ گیا۔ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ (۱۶/۴۵) جن کا انہیں سان گمان بھی نہ تھا۔ قانونِ مکافات کی کارفرمائی کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (۶/۱۲۹) "اس طرح ہم خود ظالمین کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر مسلّط کر دیا کرتے ہیں۔ تاکہ وہ انہیں ان کی دھاندلیوں کا مزہ چکھائیں۔" ان حضرات کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ خدا کے قانونِ مکافات پر ہمارا ایمان ہے اور ہم اس کے "سریع الحساب" ہونے کا بھی تصور رکھتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے تھے کہ اس کی "سریع الحسابی" کی رفتار اس قدر تیز ہوگی کہ ہنوز ایوانِ اقتدار سے ان حضرات کے ناموں کی تختیاں بھی نہ اتری ہوں گی کہ ان کا مؤاخذہ شروع ہو جائے گا، اور دنیا پکار اُٹھے گی کہ،

دیدی! کہ خونِ ناحقِ پروانہ، شمع را چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اس سے خوش ہو رہے ہیں کہ تعزیراتِ فطرت نے ان حضرات کی اس طرح گرفت کر لی، قطعاً نہیں۔ ہم تو خود خدا کے قانونِ مکافات سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ہم نے یہ کچھ محض اس لیے لکھا ہے کہ جو لوگ ہنوز برسرِ اقتدار ہیں اور قوت ان کے ہاتھ میں ہے، وہ ان لوگوں کے انجام سے عبرت پکڑیں اور سوچیں کہ ——— چاہ کندہ را چاہ در پیش ——— کس قدر ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ فطرت نہ کسی کی سوتیلی ماں ہے کہ یونہی ناکردہ جرائم کی سزا دے دے۔ نہ ہی اس کی کوئی چہیتی اولاد ہے، جو اس کی غلط کاریوں سے چشم پوشی کر لے۔ اس لئے انہیں چاہیئے کہ مہلت کے اس وقفہ سے فائدہ

اٹھا کر اپنا محاسبہ آپ کر لیں، اور اپنی سیّات کو حسنات سے بدل لیں ـــــ زاں پیشتر کہ بانگ برآید، فلاں نماند ـــــ عذاب آجانے کے بعد اس سے چھٹکارا کی کوئی صورت نہیں ہو گی۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ جو اس عذاب میں ماخوذ ہو رہے ہیں وہ کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ:۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے میری سنو، جو گوش نصیحت نیوش ہے

اس کے ساتھ ہی ہم احزاب اختلاف کی خدمت میں بھی درخواست کریں گے کہ وہ ہنگامہ آرائی کو "جہاد" قرار دے کر فریب نفس کے مرض میں مبتلا یا ابلہ فریبی کے جرم کے مرتکب نہ ہوں۔ ہنگامہ آرائی بہر نوع قابل مذمت ہے، خواہ وہ کسی کی طرف سے بھی کیوں نہ ہو، کیونکہ اس کا آخرالامر نتیجہ ملک کی تباہی ہے۔

(۲)

اس وقت ایک اور معاشرتی اصلاح کی تجویز حکومت پاکستان کے زیر غور ہے۔ یعنی شادی کے موقعہ پر جہیز اور تحائف پر قانونی پابندی عائد کرنے کی تجویز۔ اس مقصد کے لئے پچھلے دنوں ایک بل مجلس مقننہ کے زیر غور تھا۔ اب اسے رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے ایک سوالنامہ کے ساتھ اخبارات میں شائع کیا گیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کا وہ متن ہے جو روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی ۱۳؍ دسمبر کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس کی زبان ترجمہ ہی ہے۔ لیکن اس کی ضروری شقوں کا ملخص حسب ذیل ہے:۔

۱۔ جہیز اور تحائف کی مجموعی مالیت، جو کسی شادی سے پہلے، اس کے موقع پر یا اس کے بعد، خواہ بلاواسطہ یا بالواسطہ دلہن کو اس کے والدین، یا دولہا اور اس کے والدین کی طرف سے دیئے جائیں، پانچ ہزار سے زائد نہیں ہوگی۔

۲۔ کوئی شخص بجز ان کے جو شادی کے کسی فریق کے رشتہ دار یا دوست ہوں، شادی کے کسی بھی فریق کو کوئی تحفہ نہیں دیگا۔ جو رشتہ دار یا دوست تحفہ دیں گے، ان کی مالیت پانصد اور ایک صد روپے سے زائد نہیں ہوگی۔ اور یہ رقم اس پانچ ہزار میں شامل ہوگی جس کا ذکر شق (۱) میں کیا گیا ہے۔

۳۔ شادی میں دیئے گئے جہیز اور تحائف کی نمائش، رخصتی کے موقعہ پر کرنی ضروری ہوگی۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کی درآمد قانون کی رو سے ممنوع ہے۔

۴۔ شادی کے دونوں فریقوں کی جانب سے شادی پر کیئے گئے اخراجات، جہیز اور تحائف کی مالیت کو نکال کر، اڑھائی ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکیں گے۔

۵۔ جہیز، تحائف اور اخراجات کی فہرست نکاح کے رجسٹرار کو مہیا کی جائے گی۔

۶۔ خلاف ورزی کی صورت میں تین سال قید، بامشقت یا دس ہزار روپے تک جرمانہ، یا دونوں سزائیں دی جا سکیں گی۔

یہ ہے وہ طریق جس سے حکومت اس معاشرتی برائی کے استیصال کا سوچ رہی ہے۔ آپ پہلے اس کی عملی پوزیشن پر غور کیجئے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ جہیز اور تحائف کی نمائش اور صحیح صحیح فہرستیں مرتب اور مہیا کرنے کے بعد کوئی ایسی شکل باقی نہیں رہے گی جس سے ہزاروں لاکھوں بیٹے بیٹی کو نہ دیئے جا سکتے ہوں؟ دنیا کا کونسا قانون ہے جو ایسا کو بند کر سکے گا اور کونسی آنکھ ہے جو اسے بھانپ سکے گی؟

دوسری طرف مجوزہ قانون کی رُو سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی طرف آئیے۔ وہ کونسا خاندان ہے جس کے دشمن یا مخالف نہیں ہوتے؛ شادی کے بعد ان میں سے جس کا جی چاہے گا، ایک درخواست دیدے گا کہ شادی کی تقریب پر، جہیز اور تحائف کی مجموعی مالیت پانچ ہزار سے زائد تھی۔ ان اشیاء میں ایسی چیزیں بھی تھیں جن کی درآمد ممنوع تھی۔ شادی کے اخراجات اڑھائی ہزار روپے سے زائد تھے۔ جس شخص نے فلاں تحفہ دیا تھا وہ ان کا دوست نہیں تھا۔ یہ درخواست گزرے گی۔ مقدمہ ہوگا۔ فوجداری۔ پولیس ہتھکڑیاں چھنکاتی، اس گھر میں آدھمکے گی جہاں ابھی کل، عروسی شادیانے بج رہے تھے۔ اس قسم کے الزامات کے سلسلے میں دو چار گواہ بھگتا دینا کونسا مشکل ہوتا ہے۔ عدالتوں میں ہر روز ایسا ہوتا ہے نتیجتاً یا تو رشوت دیکر جان چھڑانی پڑے گی اور یا جیل جانا اور جرمانہ بھرنا۔ ذلت، رسوائی، پریشانی، اس پر مستزاد۔ یہ ہے جو اس قانون کا فطری نتیجہ ہوگا۔ اور مقدمات کی تعداد اتنی ہوگی کہ ان کے لئے خصوصی عدالتیں قائم کرنی پڑیں گی۔

جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس کے امکانات کا خود حکومت کو احساس ہے۔ اس نے سوالنامہ کے ضمن میں کہا ہے کہ:۔

لفظ تحائف پر پابندی کی خلاف ورزی اتنی ہی آسان ہو سکتی ہے جیسی کہ ایسی خلاف ورزیوں کے بارے میں جھوٹی شکایات۔

یعنی حکومت، جانتے بوجھتے، جھوٹی شکایتوں کے کھلے، اور رشوت کے چور دروازے کھولنا چاہتی ہے۔ اور ان کے ساتھ ہی سرپھٹول کے ایسے امکانات جن سے کوئی گھر بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا! اور مثبت نتیجہ اس کا صفر! ہم ارباب حکومت کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ اس مسودۂ قانون کو واپس لے لے۔ ملک میں پہلے ہی انتشار کی کمی نہیں جو اس قسم کے اقدامات سے ان میں اضافہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی معاشرتی برائیاں قوانین کی رُو سے ختم نہیں کی جا سکتیں۔ وہ کونسی برائی ہے جس کی روک تھام کے لئے ملک میں قانون موجود نہیں، اور وہ کونسا قانون ہے جس نے ان برائیوں کو ختم کر دیا ہے؟ یہاں تو ہر قانونی پابندی رشوت کا ایک نیا دروازہ کھولنے کا موجب بنتی ہے، اور برائی پہلے سے زیادہ عام ہو جاتی ہے۔ برائیاں رکتی ہیں، برائی کو برائی سمجھنے سے۔ یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے قلب و نگاہ کی تبدیلی سے، اور قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے صحیح تعلیم و تربیت سے، اور تربیت کی اوّلین شرط یہ ہے کہ برسر اقتدار طبقہ پہلے اپنی اصلاح کرے۔ لیکن یہاں سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہمارا فریضہ اتنا ہی ہے کہ قانون نافذ کر دیا جائے۔ اس سے خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔ اور ایسا سمجھنا دنیاوی حکمرانوں تک ہی محدود نہیں۔ دین کے اجارہ دار بھی اسی وہم یا فریب میں مبتلا ہیں کہ شریعت کا قانون نافذ کر دیجئے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ جماعت اسلامی نے تو "نفاذ شریعت" کی ایک ملک گیر مہم بھی شروع کر دی ہے۔ (اس قسم کی مہمیں درحقیقت الیکشن کے موسم کے طائرانِ پیش رس ہوتی ہیں۔)

اس سے کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے ہاں جہیز کا مسئلہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ لڑکے والے موزوں رشتہ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے اور جب کوئی موزوں رشتے (لڑکی) والے ہاں کر دیتے تھے تو وہ ان کے احسان مند ہوتے تھے۔ والدین جو کچھ اپنی لڑکی کو دیتے تھے بطیب خاطر دیتے تھے۔ اس وقت رشتے کی موزونیت کا معیار شرافت تھا لیکن اب شرافت، نجابت، دیانت، امانت، سب عہد رفتہ کی داستانیں بن گئیں ہیں اور معیار فقط دولت رہ گیا ہے۔ چنانچہ اب ہر معاملہ میں "کاروبار" ہوتا ہے اور شادی بھی اس سے مستثنےٰ نہیں۔ ہمارے معاشرہ کی تمام خرابیوں کی بنیادی وجہ یہی معیار (یعنی جوہرِ زر) ہے۔ جب تک اس معیار کو نہیں بدلا جاتا، معاشرہ کی کسی خرابی کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس معیار کو تو وہی صاحب اختیار بدل سکتا ہے جس کے کرتے میں دس دس پیوند لگے ہوں۔

۱۶٪

نقد و نظر

(۱) داستانِ پاکستان

یہ وہ کتاب ہے کہ جسے پڑھنا شروع کیجئے تو ختم کئے بغیر آپ سو نہ سکیں، حالانکہ یہ نہ کوئی شرلاک ہوم کا ناول ہے، نہ طلسم ہوش ربا کا سا افسانہ۔ یہ ٹھوس واقعات اور حقائق پر مشتمل ایک پاکیزہ تصنیف ہے۔ جس کا مصنف نہ کوئی ادیب ہے نہ شاعر، نہ ناول نویس نہ افسانہ نگار۔ اس کا تعلق قانون کے پیشہ سے ہے اور قانون جس قدر خار و یابس ہوتا ہے اُس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اِس کتاب کی اس قدر جاذبیت کی وجہ یہ ہے کہ:۔ ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

حصولِ مملکتِ پاکستان، تاریخی دنیا میں ایک "معجزہ" سے کم نہیں ـــــ چند سال کے عرصہ میں، ایک قطرۂ خون بہائے، اور کسی قسم کا خلفشار برپا کئے بغیر، ایک عظیم مملکت کا حاصل کر لینا دنیائے سیاست میں "معجزہ" نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ آج کا نوجوان، جسے اُس تحریک کی تاریخ سے دانستہ بیگانہ رکھا گیا ہے، بار بار پوچھتا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا تھا! اس سراپا حیرت سوال کا جواب اُسے کہیں سے نہیں ملتا ـــــ اور یہ کتاب اس کے اِس اہم سوال کا نہایت سادہ، دلکش اور، خود مصنف کے الفاظ میں "نرم و نازک" انداز سے جواب ہے۔ اس جواب کے دو اقنوم تو واضح ہیں۔ یعنی:۔

(۱) مطالبۂ پاکستان کی معقولیت اور صداقت، اور

(۲) اس کے پیش کرنے والے (قائدِاعظمؒ) کی دیانت، امانت، خلوص، قابلیت اور جانفروشانہ تگ و تاز۔

لیکن اس کے ساتھ ایک تیسرا رکن بھی ہے جسے کم اہمیت حاصل نہیں۔ اور وہ ہیں قائدِاعظمؒ کے نہایت مخلص، لیکن نسبتاً گمنام رفقائے کار، جنہوں نے اس تحریک کی عظیم عمارت کی تعمیر میں بنیاد کی اینٹوں کا کام دیا ـــــ بنیاد کی اینٹیں سر بفلک عمارت کا پورا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے ہوتی ہیں لیکن دیکھنے والوں کی نگاہوں سے ہمیشہ اوجھل رہتی ہیں۔ اور یہی اُن کے خلوص کی نشانی ہوتی ہے۔

اِس کتاب کے مصنف، چوہدری نذیر احمد خان صاحب، کا شمار تحریکِ پاکستان کی عظیم عمارت کی انہی بنیاد کی اینٹوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اِس داستان کے بیان کرنے میں بھی کچھ ایسا ہی انداز اختیار کیا ہے۔ وہ قائدِاعظمؒ کے ایک وفاشعار، سربکف سپاہی کی طرح آپ بیتی بیان کرتے چلے جاتے ہیں، جس سے اِس مجیرالعقول تاریخ کی سادہ و رنگین داستان کی مختلف کڑیاں خود بخود اُبھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ آج چوہدری صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں لیکن وہ اِس داستان کی ابتداء کرتے ہیں ۱۹۲۱ء سے، جب اُنہوں نے پہلے پہل منٹگمری میں اپنے پیشۂ وکالت کا آغاز کیا۔ لسان العصر اکبرؔ الٰہ آبادی کے کلام کے تاثر سے اُن کے سینے میں تہذیبِ فرنگ سے نفرت بلکہ بغاوت کے جذبات اُبھرے۔ مولانا ظفرؔ علی خاں جیسے شعلہ نواؤں نے ان جذبات کو ہوا دی، اور پیامِ اقبالؒ سے والہانہ شیفتگی نے اِن میں اعتدال پیدا کر کے چوہدری صاحب کی فکری صلاحیتوں کو اُجاگر کیا، اور اس کے ساتھ ہی اسلام اور ملتِ اسلامیہ سے محبت کی متاعِ گراں بہا سے انہیں نوازا۔ اس ساز و سامان کے ساتھ یہ، نو واردِ بساطِ زندگی شریکِ کارزار ہوئے۔ وہ ذرا آگے بڑھے تو وہ زمانہ آ گیا جب تحریکِ پاکستان اپنے شباب پر تھی۔ اِس دَور کے متعلق وہ لکھتے ہیں:۔

> ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء کا عہدِ افروز زمانہ ہماری زندگی کا اتنا اہم حصہ ہے کہ اس پر جتنا بھی لکھا جائے تھوڑا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم میں سے ہر شخص نشۂ پاکستان سے سرشار تھا۔ بچہ بچہ کی زبان پر "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کا نعرہ تھا۔ مخالف قوتوں نے بہت زور مارا، لیکن اب مسلم لیگ کو (جو ملتِ اسلامیہ ہندوستان کی سب سے بڑی بلکہ واحد سیاسی نمائندہ جماعت تھی) ایک ایسا لیڈر مل چکا تھا جو اُس وقت ایشیا کا سب سے بڑا آدمی تھا اور دنیا کے بہت بڑے آدمیوں میں اُس کا شمار ہوتا ہے۔ قابل، دیانتدار، مخلص، بات کا کھرا، وعدے کا پکا، قول کا سچا، نڈر، بے لالچ، کسی کے دباؤ میں نہ آنے والا، اپنے مؤقف پر قائم رہنے والا اور مسلمانانِ ہند کا سیاسی نجات دہندہ، قائدِاعظمؒ محمد علی جناحؒ۔ اِس عظیم راہبر کی قیادت میں مسلم لیگ کے نعرۂ پاکستان کو روز بروز طاقت حاصل ہوتی گئی۔ (ص۶۵)

اس "روز بروز طاقت" کے حصول اور کارفرمائی میں چوہدری صاحب جیسے رفقائے کارواں نے کس کس قسم کی مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور کس کس نوعیت کی قربانیاں دیں، اِس داستان کا حصولِ پاکستان تک کا حصہ، انہی کی زبانی سنتا چلا جاتا ہے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذیذ اور دلکش حکایت کے تمام اہم ٹکڑے پیشِ خدمتِ قارئین کئے جائیں۔ لیکن طلوعِ اسلام کی تنگ دامانی اس کے راستہ میں حائل ہے۔ اس وقت ہم اتنا بتانے پر اکتفا کرتے ہیں کہ پاکستان کے پیغام کے عام کرنے

اور اُسے دیہات تک پہنچانے میں، ان سرشارانِ نشۂ ملّت نے کیا انداز اختیار کیا تھا۔ اسے خود چوہدری صاحب کے الفاظ میں سنئیے:۔

> مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں اسی زمانہ میں گاؤں گاؤں لیگ کا پیغام پہنچا رہا تھا، تو ایک جانگلیوں کے گاؤں میں گیا۔
>
> نوٹ:۔ ضلع منٹگمری (ساہیوال) کے پرانے باشندے عرف عام میں جانگلی کہلاتے تھے اور ہم باہر سے جا کر بسنے والے آبادکار کہلاتے تھے۔ جانگلی بہت پسماندہ تھے، اور افسرانِ سرکار سے سخت ڈرتے تھے۔ اور بالکل ان کے زیرِ اثر تھے۔
>
> ۱۲۵/۱۰۰ افراد کے قریب گاؤں کے باہر جمع ہو گئے۔ علاقہ کا ہندو تھانیدار بھی پستول لگائے معہ چند سپاہیوں کے موجود تھا۔ میں نے دیہاتی زبان میں مسلم لیگ کے مؤقف کو بیان کیا۔ انگریز اور ہندو کی ناجائز مخالفت کا ذکر کیا کہ پاکستان میں اسلام کی حکومت ہوگی۔ اسلامی معاشرہ ہوگا۔ اسلامی ماحول ہوگا۔ کیا آپ اللہ اور اس کے رسولِ مقبول کا ساتھ دیں گے یا اُن کے دشمنوں کا؟ میں ابھی اپنی دلیل کی وضاحت کر رہا تھا کہ گاؤں کا بڈھا نمبردار (جو مجھے جانتا تھا) اٹھ کھڑا ہوا اور جانگلی زبان میں بولا۔ "چوہدری! کاہنوں پیا سر کھپاناں ایں اسیں کلمے دا ساتھ چھڈ سکنے آں۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ آہ تھانیدار پیا سُن دا اے۔ (یہاں تک کہہ کر نمبردار نے اپنا گریبان چاک کر دیا اور چھاتی برہنہ کرتے ہوئے کہا) آ میرے سینے وچ گولی مار دے.... انشاء اللہ مسلم لیگ دی آواز ای نکلے گی۔" (صفحہ ۱۷)

حصولِ پاکستان کے بعد بھی چوہدری صاحب کی سرگرمیاں ماند نہیں پڑیں، البتہ انہوں نے باقتضائے حالات، انداز دوسرا اختیار کر لیا۔ مقصد اس سے بھی استحکامِ ملّتِ پاکستان، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وحدتِ ملّتِ اسلامیہ تھا، اور ہے۔ یہ حصّہ بھی اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ بڑا دلکش اور جاذب ہے۔ اس میں حقائق کے ساتھ ساتھ لطائف بھی موجود ہیں۔ ایک لطیفہ سے آپ بھی لطف اندوز ہو جیئے۔ لکھتے ہیں:۔

> ایک (المناک) لطیفہ بھی سُن لیجئے۔ فروری ۱۹۷۴ء میں جو چوٹی کی کانفرنس مسلم سربراہوں کی لاہور میں ہوئی تھی اس کی تیاریوں کے دنوں میں لاہور کی ایک مقامی کلب کے نوٹس بورڈ پر یہ خوشخبری دی گئی کہ بحکم پنجاب گورنمنٹ، فلاں فلاں قسم کی اعلیٰ شراب، اب ممبران کو نہیں دی جائے گی، کیونکہ وہ سب اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقعہ پر استعمال ہونی ہے۔ (صفحہ ۱۱۶-۱۱۵)

یہ ہیں بہرحال اِس "کلامِ نرم و نازک" کی چند ایک پتیاں (جن سے ہم سمجھتے ہیں کہ "ہیرے کا جگر" بھی کٹ سکتا ہے) اس داستان سرائی سے مصنف کا مقصود کیا ہے۔ اِسے بھی انہی کی زبان سے سُنیئے، وہ کہتے ہیں:۔

> میں یہ بات پہلے واضح طور پر کہہ چکا ہوں کہ اگر سرسید، حالی، شبلی، اکبر اور اقبال نہ آتے، تو قائدِاعظمؒ کی بات "مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن" کسی کی سمجھ میں ہی نہ آتی۔ کیا ہماری یہ بدقسمتی نہیں کہ پاکستان کی نئی نسل کو نہ صرف معمارانِ پاکستان سے روشناس نہیں کرایا جا رہا بلکہ ارادۃً گمراہ کیا جا رہا ہے تاکہ وہ بھٹکنے لگیں۔ اور یہ بھٹکنا ایک خاص نظریۂ حیات نے ایجاد کیا ہے، کہ وہ اپنی عمارت ایسی ہی بھٹکی ہوئی بنیادوں پر کھڑی کرتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں۔ جن کو قائدِاعظمؒ نے کمیونسٹ (COMMUNIST) فقط کالمسٹ۔ بھارتی ایجنٹ، تخریب کار کہا تھا اور ان کی ناپاک سازشوں سے بچنے کی تلقین کی تھی۔ مگر اب یہی لوگ سرکاری کمین گاہوں میں بیٹھے اپنی ناپاک سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور کوئی ان کا محاسبہ کرنے والا نہیں۔ ہمارے ذرائع ابلاغ تو خاص طور پر ان وطن دشمنوں کے زیرِاثر ہیں۔
>
> مَیں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر پاکستان نے زندہ رہنا ہے (اور خدا کرے یہ ہمیشہ سلامت رہے) تو ہمارے نوجوان طبقہ کو اپنی تاریخ کے صحیح پہلوؤں اور نظریوں سے آگاہی لازم کرنی ہوگی۔ انہیں صاف طور پر پتہ ہونا چاہیئے کہ ہمارا قافلہ کہاں سے چلا تھا۔ اس کے کیا ارادے اور کیا عزائم تھے۔ زادِ راہ کیا تھا۔ اور اس کی منزل کونسی تھی۔ پھر اُن کو اس کی بھی تمیز ہونی چاہیئے کہ ہم اپنی مقررہ کردہ منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں یا راستے سے بالکل بھٹکے جا رہے ہیں ــــ ایسے کہ کسی دن (خدانخواستہ) قعرِ مذلت میں گر پڑیں گے۔ (صفحہ ۱۳۷)

کتاب نہایت حسین انداز میں شائع کی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں کہیں کہیں سہوِ کتابت بھی درانداز ہو گئے ہیں لیکن یہ ہمارے موجودہ طرزِ طباعت کا گویا جزوِ لازم ہو چکے ہیں، اس لئے ناگزیر ہیں۔ بایں ہمہ ان سے کتاب کی اہمیت یا دلکشی مجروح نہیں ہوتی۔ اس کی قیمت بیس روپے ہے، اور فیروز سنز لمیٹڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

ط مصنف نے کتاب کا سرنامہ علامہ اقبالؒ کے اس شعر سے مزین کیا ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

(۲) تذکرۂ مصنّفینِ درسِ نظامی

مصنف:۔ اختر راہی صاحب (ایم۔ اے۔ لیکچرار گورنمنٹ کالج۔ مری) شائع کردہ۔ مسلم اکادمی ۱۸/۲۹ محمد نگر لاہور۔ تقطیع خورد۔ صفحات ۲۷۲۔ نیوز پرنٹ۔ قیمت بلا جلد چھ روپے۔

زیرِ تبصرہ کتاب درسِ نظامی کی کتابوں کے مصنفین کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ یہ وہ نظامِ تعلیم ہے، جس کی تکمیل پر "عالمِ دین" کا خطاب مل جاتا ہے۔ برصغیر ہند و پاکستان میں یہ نظام ملا نظام الدین مرحوم نے آج سے کوئی اڑھائی سو سال پہلے شروع کیا تھا اور اس کے بعد معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ ابھی تک جاری ہے۔

آج سے پورے ایک سو سال پہلے سرسید احمد خاں نے اس درسِ نظامی کا تنقیدی مطالعہ کیا، اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اپنے وقت میں یہ نظامِ تعلیم جیسا کچھ بھی مفید تھا، سو تھا۔ لیکن اب یہ اپنی افادیت کھو چکا ہے، جس کی وجہ سے وہ جدید زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسے ختم کر کے جدید تعلیمی نظام کو اختیار کر لینا چاہیئے۔ اور پھر وہ جس نتیجے پر پہنچے اپنی ساری زندگی اس کے لئے وقف کر دی۔ علی گڑھ یونیورسٹی ان کی ان کوششوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ جسے صحیح معنوں میں پاکستان کی بنیادی اینٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔

درسِ نظامی کو صرف سرسید احمد خان ہی نے بے جان قرار نہیں دیا تھا۔ ان کے بعد بھی جس شخصیت نے بھی مسلمانوں کی اصلاح کرنے کا پرچم اٹھانے کا دعویٰ کیا، اس نے اس نظامِ تعلیم کے بارے میں کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ مودودی صاحب جیسے قدامت پسند نے بھی سرسید سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں اس پر تنقید کی اور اسے بے جان مذہبیت پیدا کرنے والا نظام قرار دیا، ان کے الفاظ ہیں:۔

> لیکن جب وہ سیاسی نظام برپا ہوا، جس کی بدولت ہم غلام ہوئے، تو اس پورے نظامِ تعلیم کی افادیت ختم ہو گئی ..... اب جو لوگ اس نظامِ تعلیم کے تحت پڑھ رہے ہیں اور اس سے تربیت پا کر نکل رہے ہیں، ان کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ہماری مسجدوں کو سنبھال کر بیٹھ جائیں، یا کچھ مدرسے کھول لیں۔ اور طرح طرح کے مذہبی جھگڑے چھیڑتے رہیں۔ تاکہ اِن جھگڑوں کی وجہ سے قوم کو ان کی ضرورت محسوس ہوتی رہے
>
> (تعلیمات" از مودودی صاحب۔ صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹)

مودودی صاحب نے اپنی مختلف کتابوں میں درسِ نظامی پر اس لئے بڑی کڑی تنقید کی ہے کہ ان کے خیال کے مطابق یہ مسخ شدہ مذہبیت پیدا کرتا ہے۔ ان کی ان ساری تنقیدوں کو تو نقل نہیں کیا جا سکتا ہے ہم اس کی ایک معمولی سی جھلک دکھاتے ہیں:۔

دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے، اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے، اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہارِ قدرشناسی تو کر سکتے ہیں مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لئے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔

("مسلمان اور سیاسی کش مکش" حصہ سوم صفحہ ۱۸۶ - ۱۸۷)

مختصر یہ کہ مودودی صاحب درسِ نظامی کو برصغیر کے مسلمانوں کے زوال کا ایک اہم سبب قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر انہوں نے اعلان کیا کہ :-

ان کتابوں میں دین کا حصہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا جتنا آٹے میں نمک کا۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن بابت نومبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۹۷)

اب انہی کتابوں کے مصنفین کے حالاتِ زندگی زیرِ تبصرہ کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔

کتاب پر تبصرہ لکھنے کے لئے بیٹھا تو اس سلسلے کا ایک اہم واقعہ یاد آ گیا۔ آج سے کوئی پندرہ سال پہلے، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے کہا کہ ایک امریکی ادارہ درسِ نظامی کے مدارس کا تفصیلاتی مطالعہ کرنا چاہتا ہے، اور اگر آپ لوگ اس سے تعاون کریں تو اچھا بھلا معاوضہ مل سکتا ہے۔ بدقسمتی سے انہی دنوں اس امریکی ادارے کے بارے میں اخبارات میں کچھ ناپسندیدہ خبریں آ رہی تھیں۔ اس لئے میں نے اس پروجیکٹ میں شمولیت سے معذرت کر دی۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔ اس کے کئی سال بعد ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، کے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ "مسلم اکادمی لاہور" نے جس نے کتاب زیرِ تبصرہ شائع کی ہے، انہی خطوط پر مدارسِ عربیہ کا جائزہ تیار کیا ہے، اور یہ کہ اسے اس امریکی ادارے کا تعاون بھی حاصل تھا۔ لیکن چونکہ خود اس جائزے میں اس بارے میں کوئی اشارہ تک موجود نہیں تھا، اس لئے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

چند ماہ ہوئے ایک اور صاحب جو ایک واسطے سے میرے شاگرد بھی تھے، اسی قسم کا ایک اور جائزہ تیار کر رہے تھے۔ یہ صاحب جناب ممتاز احمد صاحب ہیں، جو کچھ عرصہ پہلے تک ماہنامہ چراغِ راہ کراچی، کے مدیرِ معاون تھے۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی یہ جائزہ ایک امریکی ادارے کے تعاون سے تیار کر رہے ہیں، اور یہ کہ یہ پروجیکٹ بھی انہیں ڈاکٹر فضل الرحمٰن

کے تعاون سے ملا ہے۔ میں نے مسلم اکادمی والے جائزے کی طرف اشارہ کیا، تو جواب ملا کہ وہ بوجوہ نامکمل ہے۔ معلوم نہیں کہ ممتاز صاحب نے اپنا پروجیکٹ کس حد تک مکمل کر لیا ہے۔ لیکن راقم ابھی تک اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکا کہ وہ نظام جسے مصلحینِ اُمت ایک صدی پیشتر مردہ قرار دے چکے ہیں، اسے دوبارہ کس مقصد کے لئے زندہ کیا جا رہا ہے؟ یہاں تک کہ وہ حضرات بھی جو اُسے ساری عمر مسخ شدہ مذہبیت پیدا کرنے والا نظام قرار دیتے رہے، اب اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان نظر آنے لگے ہیں:

> مجھے قدیم اور جدید دونوں مدارس میں تھوڑی مدت پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، اور میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ درسِ نظامی کا نصاب ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرنے کے اعتبار سے جدید مدارس کے نصاب سے کہیں بہتر ہے۔ اس نصاب کو اگر اچھے طریقے سے پڑھ لیا جائے تو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کو سمجھنے کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔
>
> (اشارات ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۶/۱۶)

یہ ہیں درسِ نظامی کو دوبارہ اجاگر کرنے کی کوششیں، جس کی ایک کڑی کتاب زیرِ تبصرہ ہے۔ جس میں درسِ نظامی کی ان سب کتابوں کے مصنفین کا تعارف کرایا گیا ہے۔ وہ کتابیں جن کے بارے میں ہم مودودی صاحب کی یہ تحقیق جلی حروف میں نقل کر چکے ہیں کہ ان میں آٹے میں نمک برابر بھی دین نہیں ہے۔ مودودی صاحب نے اپنی کتاب "اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصوّرات" کے صفحات ۴۲۷، ۴۲۸ پر یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کتابوں میں اصل کی بجائے زیادہ تر شرحیں یا حاشیوں کے رَدّے چڑھے ہوئے ہیں اور ان کی اس تحقیق کی تائید زیرِ تبصرہ کتاب سے بھی ہوتی ہے۔ اس تذکرہ میں فاضل مؤلف جس ہستی کو سب سے بڑا فاضل علّامہ قرار دیتے ہیں، ان کا سب سے بڑا علمی سرمایہ بھی یہی حاشیئے ہیں۔ "عقائدِ جلالی" کے شارح، محقق جلال الدین دوانی کے متعلق فاضل مصنّف فرماتے ہیں کہ مسلم فلاسفہ و حکماء میں گنتی کے چند افراد "محقق" کے نام سے علمی دنیا میں معروف ہیں، ان میں سے ایک محقق دوانی ہیں۔ (صفحہ ۸۱) اور پھر آخر میں ان کا علمی سرمایہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

> دوانی نے عربی و فارسی دونوں زبانوں میں علم و ادب کا خاصہ وقیع ذخیرہ، یادگار چھوڑا ہے۔ ان ہی گوہر ہائے گراں مایہ کے پیشِ نظر قوم نے ان کو محقق کا خطاب دیا۔ دوانی کے رشحاتِ قلم میں زیادہ تر حواشی اور شرحیں ہیں (صفحہ ۸۶)

زیرِ تبصرہ کتاب کے فاضل مصنّف کی ڈگریوں سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی جدید تعلیمی ادارے کے فارغ التحصیل ہیں۔ لیکن ان کا طرزِ استدلال وہی مقلدانہ ہے۔ یعنی اپنے مطلب کے لئے متضاد دلائل کا سہارا لینا۔ مثلاً صفحہ ۱۷۰ پر تو یہ تحقیق پیش کرتے ہیں کہ مغلیہ سلطنت کا زوال، مجالسِ علمی

کا عروج تھا۔ لیکن صفحہ ۲۹۲ پر اس کے برعکس تحریر فرماتے ہیں کہ "مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی دینی لحاظ سے جاہل پیروں اور مکار صوفیوں نے بدعات و خرافات کا بازار گرم کر لکھا تھا۔" اسی طرح، وہ آج کے زمانے میں بھی درہم کو چار آنے کے برابر سمجھتے ہیں۔ (صفحہ ۲۵۰) یعنی اس کی وہ شرح مبادلہ جو آج سے دو سو سال پہلے مقرر کی گئی تھی۔ جبکہ چاندی کی قیمت آٹھ دس آنے فی تولہ تھی، حالانکہ اب پاکستان میں چاندی کی موجودہ قیمت اس وقت سے تیس گنا اور عرب ممالک میں ساٹھ گنا زیادہ ہے۔

ہمارے علماء ان مسلمانوں سے نفرت کا اظہار کرتے رہے ہیں، انہوں نے انگریزوں سے تعاون کیا، اور ان کی زبان' انگریزی' سیکھنے کی ترغیب دی۔ ان میں سرفہرست سر سید احمد خاںؒ تھے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ایک دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ درسِ نظامی میں سر سید احمد خاںؒ کے ایک گہرے دوست مولانا محمد احسن نانوتویؒ کی کتاب' مفید الطالبین' بھی شامل ہے۔ مولانا صاحب صرف انگریزی دان ہی نہ تھے بلکہ جیسا کہ زیرِ تبصرہ کتاب میں تسلیم کیا گیا ہے وہ انگریزوں کے وفادار بھی تھے اور ان کے حق میں تبلیغ بھی کرتے تھے۔ (صفحہ ۲۰۹) اور ان کی اس تبلیغ سے مشتعل ہو کر مسلمانوں نے انہیں دہلی سے نکلوا دیا تھا۔ (ایضاً) فاضل مصنف نے بھی سر سیدؒ سے ان کی دوستی کو تسلیم کیا ہے اور یہ کہ مولانا نے انہی یعنی سر سیدؒ کی فرمائش پر ایک انگریز جعفرے ہگنز کی کتاب کا 'حمایتِ اسلام' کے عنوان سے ترجمہ کیا تھا۔

درسِ نظامی میں ایک اور کتاب "نفحۃ الیمن" ہے۔ جس کے مصنف نہ صرف یہ کہ انگریز کی ملازمت میں ہونے کی وجہ سے انگریز نواز تھے، بلکہ پرلے درجے کے فحش نویس تھے۔ اور ان کی مذکورہ بالا کتاب فحش واقعات اور مناظر سے بھرپور ہے۔ جسے خود فاضل مصنف نے بھی تسلیم کیا ہے۔ (صفحہ ۶۶) چنانچہ اس فحاشی سے بچنے کے لئے انہی خطوط پر "نفحۃ العرب" کے عنوان سے مولانا اعزاز علی صاحب دیوبندی نے کتاب مرتب کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ابھی تک نفحۃ الیمن" درسِ نظامی میں شامل ہے۔

درسِ نظامی کی زبان فطری طور پر عربی ہے۔ کیونکہ یہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لئے مدون کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ستر مصنفین میں سے صرف دو کا تعلق جزیرہ عرب سے ہے، اور ان میں سے ایک نفحۃ الیمن کے مصنف ہیں جن کا تذکرہ ابھی ابھی گذرا ہے۔

اِس کتاب کے مطالعہ سے ایک اور خصوصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ ویسے تو ہر معاملے میں بزرگانِ دین کی مکمل تقلید کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن جن امور میں یہ تقلید ملتِ اسلامیہ کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ان سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے بزرگانِ دین کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ دین کی خدمت بلامعاوضہ کرتے تھے اور اپنے معاش کے لئے انہوں نے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ فاضل مصنف نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے

(باقی بر صفحہ ۶۳)

حقائق و عبر!

(۱) عمر ضائع ہو گئی

مولانا انور شاہ کاشمیری (دیوبندی) دنیائے علم و تقویٰ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کا نام سُنتے ہی نگاہیں احترام سے جھک جاتی ہیں۔ ان کی آخری زندگی کا ایک عبرت آموز واقعہ مفتی محمد شفیع صاحب کی زبانی موقر ماہنامہ "میثاق" کی نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جو اِس قابل ہے کہ اُسے نہایت غور اور فکر سے ملاحظہ کیا جائے، وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گذار کروں جو اہم بھی ہے اور عبرت خیز بھی، قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا، اور سیّدی حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نمازِ فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "حضرت کیسا مزاج ہے؟" کہا۔ "ہاں! ٹھیک ہی ہے میاں، مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی!"

میں نے عرض کیا۔ "حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گذری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی!"

فرمایا۔ "میں تمہیں صحیح کہتا ہوں، عمر ضائع کر دی!"

میں نے عرض کیا۔ "حضرت بات کیا ہے؟"

فرمایا۔ "ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا، خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔"

"اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم اُن پر کوئی احسان کریں؟ اُن کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے

خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں اور امام شافعیؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے (مثلاً حنفی) کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح، قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے، اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطاء" (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو "خطاء محتمل الصواب" (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) لیکن اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں"

پھر فرمایا:-

"ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کونسا مسلک صواب تھا، اور کونسا خطاء- اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا- دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح- یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو، دنیا میں تو یہ ہے ہی، قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق یا بالسر حق تھی- برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا"

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ تھے:-

"اللہ تعالٰی شافعیؒ کو رسوا کرے گا، نہ ابوحنیفہؒ کو، نہ مالکؒ کو، نہ احمد بن حنبلؒ کو، جن کو اللہ تعالٰی نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنہوں نے نورِ ہدایت چاروں سو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سُنّت کا نور پھیلانے میں گذریں اللہ تعالٰی ان میں سے کسی کو رُسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا- یا اس کے برعکس، یہ نہیں ہوگا-

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی، اپنی قوّت صرف کر دی، اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاءِ کرامؑ لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی- آج یہ دعوت، تو نہیں دی جا رہی- یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار اُن کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں، اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیئے تھا وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے، شرک و بت پرستی چل رہی ہے، حرام و حلال کا امتیاز اُٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی و فروعی بحثوں میں!"

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا- "یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی"

طلوعِ اسلام

یہ تاثر درحقیقت، عبرت آموز تفسیر ہے قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی جس میں اس نے اسلاف کے ساتھ ہمارے رشتہ اور تعلق کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:-

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ (۲/۱۴۱)

یہ لوگ اپنے اپنے کام سرانجام دے کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے جو اچھے کام کئے ان کی انہیں جزا ملے گی اور ان کی غلطیوں کا اُن سے مواخذہ ہوگا۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ (تم سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا۔)

کیا ہمارے علمائے کرام بالعموم اور وابستگانِ دیوبند بالخصوص حضرت شاہ صاحبؒ کے اس حاصلِ زندگی سے کچھ سبق حاصل کریں گے؟ (لیکن یہ کبھی ایسا نہیں کریں گے!)

(۳) ترکِ قرآن

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ دیوبندی کا مقامِ بلند بھی کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اسی ماہنامہ کے صفحہ ۴۸ پر (مفتی محمد شفیع صاحب ہی کے حوالے سے) ان کا ایک واقعہ درج ہے جو اسی طرح غور و فکر کا محتاج ہے۔ شیخ الہند مرحوم نے فرمایا:-

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

حضرت شیخ الہندؒ نے جو فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا اور دوسرے آپس کے اختلافات۔ تو یہ دوسرا سبب، بھی درحقیقت پہلے سبب ہی کا فطری نتیجہ ہے۔ قرآن کریم نے اپنے نزول کا مقصد یہ بتایا تھا کہ وہ نوعِ انسان کے اختلافات کو ختم کر دے گا۔ لہٰذا قرآن کریم کو چھوڑ دینے کا فطری نتیجہ باہمی اختلافات ہیں اور ان کے مٹانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر

اختلافی معاملہ میں قرآنِ کریم کو آخری اتھارٹی تسلیم کر لیا جائے۔

لیکن یہاں مصیبت یہ ہے کہ جن لوگوں کے روزگار کا دارومدار ہی ان اختلافات پر ہے، جب شخص انہیں قرآن کو اتھارٹی تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہ اس پر کفر کے فتوے لگا دیتے ہیں۔ اور ان اختلافات کی رُو سے پیدا شدہ فرقوں کو "مکاتبِ فکر" کا نام دے کر خود فریبی یا دانستہ فریب دہی کا شکار ہو جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے وہ تباہی رُک جائے گی جس کی لپیٹ میں اس وقت تمام کی تمام اُمتِ مسلمہ آ چکی ہے۔

(۳) اپنے گھر کی خبر لیجئے!

حکومت کے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے ماہنامہ "فکر و نظر" کی نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں (اس کی زندگی میں شاید پہلی بار) ایسا اداریہ شائع ہوا ہے جس میں ملّتِ پاکستانیہ سے متعلق کسی عملی مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے مسلک میں اس خوشگوار تبدیلی پر ہم اُسے درخورِ مبارک باد سمجھتے ہیں۔ اس اداریہ میں لکھا ہے:-

> ہمارے قومی وجود کی روح جس قالب میں متمکن ہے، اس کا نام پاکستان ہے۔ پاکستان اسلام کا گہوارہ، سات کروڑ مسلمانوں کا وطن اور دنیائے اسلام کی امیدوں کا مرکز۔ آج اس پاکستان میں ایسے فتنے سر اٹھا رہے ہیں کہ اگر بروقت ان کا سدِّباب نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ ہمارا قومی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ ان تازہ فتنوں میں سب سے بڑا فتنہ جس کے بطن سے نجانے اور کتنے فتنے جنم لے چکے ہیں، یہ سوال ہے کہ آیا ہم ایک قوم ہیں یا ایک سے زائد۔ اس فتنے کی اگرچہ کوئی جڑ بنیاد نہیں، اور کسی بھی فتنے کی کوئی جڑ بنیاد نہیں ہوتی۔ اور یہ محض چند نام نہاد دانشوروں کی طرف سے اٹھایا گیا فتنہ ہے، لیکن پھر بھی فتنہ، فتنہ ہوتا ہے، اور اگر بروقت اس کا تدارک نہ کیا جائے تو بعد میں اس کی تباہ کاریوں پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں قبل اس کے کہ پانی سر سے گذر جائے، ایسے تمام فتنوں کے استیصال کی سبیل کرنی چاہیئے جو ہمارے قومی وجود کے لئے خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں۔

اِس کے بعد اُس میں اس خطرہ کی نشاندہی کی گئی ہے جو ملک میں متعدد قومیتوں کے رنگ میں نمودار ہو رہا ہے۔ اِس ضمن میں وہ لکھتا ہے:-

> لاریب پاکستان کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ پاکستان میں ایک سے زیادہ قومیت کی بات اس قوم کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہے۔ عالمگیر قومیت کی علمبردار ملت ایک

محدود جغرافیائی وحدت میں متعدد قومیتوں کا تصور کبھی بھی قبول نہیں کر سکتی۔ اس قسم کے تصور کی اشاعت و تبلیغ سے فقط ہمارے دشمن کے مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس لئے کوئی ہوشمند پاکستانی مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی اس قسم کے لغو اور بیہودہ نعروں کی طرف توجہ نہیں دے سکتا۔

دوسرے خطرہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ "اس سے ملتا جلتا ایک اور نعرہ چار ثقافتوں کا ہے۔ اس نعرہ کا مقصد بھی وہی ہے، یعنی اہلِ پاکستان میں یہ خیال پیدا کرنا کہ وہ ایک نہیں چار ہیں۔" (صفحہ ۳۹۷) اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں دی گئی ہے:-

"چار ثقافتوں کا آوازہ بلند کرنے والوں کا مقصد چونکہ تالیف کی بجائے پاکستانی قوم کا شیرازہ بکھیرنا ہے، اس لئے وہ اس کی ایسی تعبیر پیش کرتے ہیں جس کی روشنی میں وہ آسانی سے لوگوں کو دھوکا دے سکیں اور یہ ثابت کر سکیں کہ پاکستان ایک نہیں چار بلکہ اس سے بھی زائد ثقافتوں کا ملک ہے۔ ہماری نظر میں چونکہ تاریخی عوامل کے زیرِ اثر پاکستانی مسلمان ایک واحد قوم ہیں، اس لئے ان کی "ثقافت" بھی ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اور ظاہر ہے اس ثقافت کے اجزائے ترکیبی وہ نہیں ہوں گے جو قوم کو جوڑنے والے نہیں بلکہ توڑنے والے ہوں۔

اس صورت میں ہماری ثقافت یقیناً اس ثقافت سے مختلف ہوگی جو قوم کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے والی ہو اور جس کا نفسیاتی پس منظر قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ **کل حزب بما لدیھم فرحون**۔ ہر گروہ اس پر نازاں ہے جو ان کے پاس ہے اور اجتماعی زندگی میں اس انداز فکر کے کیا نتائج نکلتے ہیں، بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ طرزِ فکر انسان کو عصبیتِ جاہلیہ کی طرف لے جاتا ہے، جو اسلام سے پہلے عرب کی قبائلی زندگی میں تمام و کمال موجود تھی اور جس کے متعلق قرآن مجید نے کہا ہے کہ "**وکنتم علی شفا حفرۃ من النار**" اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے انہیں نجات دے کر ایسے مقام پر پہنچا دیا، جہاں وہ عصبیتِ جاہلیہ کی بجائے اخوتِ اسلامی کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ یہ کام ہمارے اجتماعی قومی اداروں کا ہے کہ وہ ثقافت کی ایسی تعبیر پیش کریں جو پشاور سے کراچی تک مختلف علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہو۔ اور جس کی اساس ہمارے عقائد، نظریات اور قومی اقدار پر ہو۔ ثقافت کے ایسے خط و خال کو نمایاں کر کے ہی ہم صحیح معنوں میں پاکستان کے تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتے ہیں۔"

لاریب، کہ جن خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے وہ پاکستان کے استحکام کے لئے حقیقی خطرے ہیں ——— اور طلوعِ اسلام کی تو کوئی ایک اشاعت بھی ایسی نہیں جس میں ان خطرات کو ہانک، پکار کر سامنے نہ لایا گیا ہو ——— لیکن ہم اپنے اس ہم عصر سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ فتنہ کہاں سے ابھر رہا ہے اور اسے کون ہوا دے رہا ہے؟ یہ حقیقت کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ یہ فتنہ ان لوگوں کی

طرف سے ابھارا جا رہا ہے، جو خود مرکزی حکومت پاکستان کے زیرِ سایہ عافیت بیٹھے سرگرمِ عمل ہیں، اور ان کی نشر و اشاعت کے لئے خود حکومت کے ذرائع ابلاغ استعمال کر رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی مرکزی حکومت سے متعلق ہیں اور ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی بھی مرکزی حکومت ہی کی وزارت امورِ مذہبی کا ایک شعبہ ہے۔ ہم نے اپنی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۵ء میں محترم مولانا کوثر نیازی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ (اور اب وہی سوال ادارہ تحقیقاتِ اسلامی سے پوچھنا چاہتے ہیں) کہ بالآخر یہ معمہ کیا ہے کہ حکومت کا ایک بازو اس عظیم فتنہ کو مشتعل کرنے میں مصروف ہے اور اسی کا دوسرا بازو خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔ معاف فرمائیے، کیا یہ وہی ٹیکنیک تو نہیں جسے قدیم محاورہ میں "جنگ زرگری" سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اہلِ لاہور کی عام زبان میں "نورا کشتی" کہہ کر پکارا جاتا ہے یا جسے زبانِ شعر میں یوں ادا کیا گیا ہے کہ ؎

یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا ۔۔۔ دے پیچ اُدھر زلف اڑا لے گئی دل کو

کیا معاصر فکر و نظر اس اہم سوال کا جواب دینے کی زحمت گوارا کرے گا؟

---

(۴) ذرا کھل کر بات کیجئے۔

اسی ماہنامہ (فکر و نظر) کی اکتوبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں سید مناظر احسن گیلانی کی کتاب "اسلام اور نظامِ جاگیرداری و زمینداری" پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اس مسئلہ میں بڑا اختلاف ہے کہ زمین کی بٹائی پر کرایہ لینا جائز ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ:-

> یہ مسئلہ اختلافی اس لئے ہوگیا کہ کتاب اللہ میں اس کے بارہ میں کوئی نص صریح نہیں ملتی۔ اور احادیثِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہ و تابعین میں موافق اور مخالف دونوں قسم کا مواد ملتا ہے۔ (صفحہ نمبر ۳۹۰)

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اُمت کو بطور مسلّمہ یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم اور احادیثِ رسول اللہ کے مجموعہ سے دین مکمل ہو جاتا ہے۔ مزارعت کا مسئلہ دین میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسے ایک گروہ ربٰو قرار دیتا ہے اور قرآن کریم ربٰو کو خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ کہہ کر پکارتا ہے۔ دین کے ایسے اہم اور بنیادی مسئلہ کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ کتاب اللہ اس کے بارے میں خاموش ہے اور احادیثِ رسول اللہؐ میں موافق اور مخالف دونوں قسم کا مواد ملتا ہے۔

ہم ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی سے درخواست کریں گے کہ وہ ذرا وضاحت سے بتائے کہ جب صورت یہ ہے تو پھر دین کے معاملہ میں قرآن کریم اور احادیثِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

ہم اُن کی خدمت میں یہ بھی عرض کریں گے کہ انہوں نے جو لکھ دیا ہے کہ "کتاب اللہ میں اس کے بارے میں کوئی نص صریح نہیں ملتی" تو یہ ان کی کورچشمی کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور جب صورت یہ ہے تو پھر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ زمین کو بٹائی یا کرایہ پہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

اس کے بعد اس تبصرہ میں اس مشکل کا حل حسبِ ذیل بتایا گیا ہے۔

> ہماری رائے میں اس قسم کے اختلافی مسائل میں فیصلہ کرنے کا مؤثر اور قابلِ عمل طریقہ یہی ہے کہ آج مزارعت سے پیدا ہونے والی مختلف صورتیں جن سے لوگوں کو فائدہ یا نقصان پہنچتا ہے سامنے لائی جائیں۔ مضرت و منفعتِ عامہ کا موازنہ کیا جائے اور ملکی حالات کو پیشِ نظر رکھ کر اقتصادیات و زرعیات اور شریعت کے ماہرین یہ فیصلہ کریں کہ اس دور میں ہمارے عوام اور ملک کے لئے کس صورت میں زیادہ فائدہ ہے۔ ملکی امن کا استحکام، زمینوں کی آبادکاری، پیداوار میں اضافہ اور کسانوں کی خوشحالی کے لئے کونسی صورت مفید رہے گی۔ اس بارے میں ان ماہرین کے فیصلہ کو ملحوظ رکھ کر اگر اسمبلی مزارعت کو موجودہ حالات میں ظالمانہ معاملہ سمجھتے ہوئے روکنا چاہے تو وہ قانون بنا کر ملک کو اس کشمکش سے نجات دے۔ ایسے اختلافی مسائل کا یہی اسلامی حل کہلائے گا۔

اسلامی مملکت میں صحیح طریقِ کار ہے بھی یہ، بشرطیکہ اسے اس شرط کے ساتھ مشروط کر لیا جائے کہ اسمبلی کا فیصلہ قرآن کریم کی متعین کردہ حدود سے نہیں ٹکرائے گا۔ طلوعِ اسلام پہلے دن سے یہ آواز بلند کر رہا ہے کہ قرآن کریم نے جن امور کو اصولی طور پر بیان کیا ہے اور ان کی تفصیلات خود متعین نہیں کیں، مملکتِ اسلامیہ کا فریضہ ہوگا کہ وہ قرآن کے مشاورتی نظام کے مطابق ان تفصیلات کو متعین کر کے قوانینِ مملکت کی حیثیت سے ملک میں نافذ کرے۔ اگر اسلامی نظریاتی کونسل یا ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اس اصول کو تسلیم کر لیتا تو قانون سازی کے معاملہ میں نہ تو قوم میں کوئی الجھاؤ پیدا ہوتا اور نہ ہی حکومت اس کشمکش میں گرفتار ہوتی۔ جس سے چھٹکارا پانے کی اُسے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اور مذہبی پیشوائیت جس کا پوری طرح سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ وہ کونسل ہو یا یہ ادارہ، ان کی مصلحتیں انہیں دو ٹوک بات کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔ وہ اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں کہ ؎

با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

---

(۵) دین میں مفاہمت

گزشتہ اگست (۱۹۷۵ء) میں جماعتِ اسلامی کے نئے مرکز، منصورہ (لاہور) میں اسلامی جمعیتِ طلبہ پنجاب کا پانچ روزہ تربیتی پروگرام عمل میں لایا گیا۔ اس میں ایک اہم کڑی مودودی صاحب سے سوال و جواب بھی تھی۔ معاصر "ایشیا" کی ۳۱ اگست ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں شائع شدہ روئیداد کے مطابق۔

پہلا سوال تھا۔ "بعض مذہبی عناصر دین کا صحیح تصور پیش نہیں کرتے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان کی مغالطہ انگیزیوں کو وضاحت کے ساتھ رد کریں۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ان کی کھل کر تردید نہیں کرتے۔ کیا ہم نے جاہلیت کے ساتھ مفاہمت کر لی ہے؟"

سوال کی اہمیت واضح ہے۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا:۔

جاہلیت کے ساتھ مفاہمت اور چیز ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ مفاہمت کرنا جو نقلی مال بیچتے ہیں، اور چیز۔ ہم تصادم سے بچنا چاہتے ہیں۔ ہم اسلام کا نام لے کر کام کرنے والوں سے نزاع نہیں چاہتے۔ عوام بظاہر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دونوں اسلام کا نام لیتے ہیں، اس لئے دونوں صحیح بات کہتے ہیں۔ لیکن اسلام کا صحیح فہم رکھنے والے دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ کون محض اسلام کا نام استعمال کرتا ہے اور کون اسلام کا صحیح کام کرتا ہے۔ اس کی وضاحت انشاءاللہ ہوتی چلی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ "نقلی مال بیچنے والوں" سے مراد مذہبی پیشوائیت ہے ـــــ یعنی مروّجہ اسلام کے حامل علماء اور مذہبی فرقے۔ مودودی صاحب ان سے نزاع اور تصادم نہیں چاہتے۔ مقصد واضح ہے۔ ان سے نزاع اور تصادم کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ لوگ جماعتِ اسلامی کے مخالف ہو جائیں گے اور چونکہ ملک میں اکثریت انہی کی ہے، اس لئے یہ جماعت ان تمام مفادات سے بھی محروم ہو جائے گی، جو اسے اسلام کے نام پر عوام سے حاصل ہوتے ہیں، اور انتخابات میں ان کے ووٹوں سے بھی محروم ـــ لہٰذا مفاد پرستی اور "حکمتِ عملی" کا تقاضہ یہی ہے کہ، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ دھوکہ باز ہیں، نقلی مال بیچتے ہیں، اسلام کا نام لے کر جاہلیت کے مشرکانہ اور کافرانہ نظریات و مسالک پھیلاتے چلے جاتے ہیں، ان سے متصادم نہیں ہونا چاہیئے۔ آیئے ہم آپ کو بتائیں کہ اسلام کا لیبل لگائے ہوئے اس قسم کی جاہلیت کے متعلق اس سے پہلے مودودی صاحب کے خیالات کیا تھے اور وہ اسے کیسا عظیم خطرہ قرار دیتے تھے۔ مودودی صاحب نے "تجدید و احیائے دین" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ

ط اب یہ کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

لکھا، جو اُن کے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ حضرت عثمانؓ[1] کے زمانہ میں "جاہلیت" نے کس طرح اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اِس ضمن میں انہوں نے لکھا کہ:-

> سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریئے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا، اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اُس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سرہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان علانیہ اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اُس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور الٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے۔ جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلّم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔ (صفحہ ۲۸۳)

اسلام کے لئے یہ کتنا عظیم خطرہ تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ مودودی صاحب نے لکھا کہ:-

> اِن جاہلیتوں کے ہجوم سے اسلام کو نکالنا اور اُسے پھر سے چمکا دینا وہ کام تھا، جس کے لئے دین کو مجدّدین کی ضرورت پیش آئی۔ (صفحہ ۲۸۵)

یہ وہ زمانہ تھا جب مودودی صاحب کو عوام کی حمایت اور ووٹوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اور وہ عام مولویوں سے ہٹ کر اپنا ایک منفرد مقام متعین کرنے کی فکر میں تھے۔ آج مودودی صاحب اُسی نقاب پوش جاہلیت کے ساتھ مفاہمت ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس کے باوجود دعویٰ یہ ہے کہ ہم اس ملک میں اقامتِ دین کے واحد علمبردار ہیں۔ (باقی بر صفحہ ۶۴)

---

[1] واضح رہے کہ اگرچہ مودودی صاحب کسی صحابی کو بھی نہیں بخشتے، لیکن حضرت عثمانؓ تو ان کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتے ہیں۔ اُن کی رسوائے زمانہ کتاب ـــــ "خلافت و ملوکیت" ـــــ اس امر کی بیّن شہادت ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

جہاں مارکس ناکام رہ گیا

(اُس سے آگے)

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۵ء سے

پرویز صاحب کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جہاں مارکس ناکام رہ گیا

(اُس سے آگے)

انسان کا طریقہ یہ ہے کہ کرۂ ارض پر اس کی نمود سے پہلے وہ تمام سامان موجود تھا جس پر اس کی زندگی کا دارومدار تھا۔ پانی، روشنی، حرارت اور زمین میں غذا کے ذخائر۔۔۔ اور اس کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے باوجود، کرۂ ارض پر انسانوں کی نصف سے زیادہ آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک کی یہ شدت اور کثرت ہمارے زمانے میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، لیکن مسئلہ یہ آج کا نہیں۔ قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

ہم تاریخِ انسانی کے ابتدائی ادوار میں دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی آبادی بالعموم زمین کے اُن خطوں میں ہوتی تھی جہاں کی آب و ہوا گرم اور پانی کی افراط ہو۔ ان طبیعی اسباب کی وجہ سے غذائی پیداوار بکثرت ہو جاتی تھی، اور چونکہ آبادی ابھی بہت کم تھی، اس لئے اس زمانے میں روٹی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہی وہ دور تھا جسے قرآن کریم نے قصۂ آدمؑ کے تمثیلی انداز میں جنتِ ارضی کی زندگی کہہ کر پکارا ہے۔ جس میں کیفیت یہ تھی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) جہاں کسی کو بھوک لگتی، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا۔ اس وقت "میری" اور "تیری" کی تمیز اُبھری ہی نہیں تھی۔ ہم تاریخ میں ذرا آگے بڑھتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ زور آور انسانوں نے کمزور انسانوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے جو اُن کے لئے خوراک پیدا اور جمع کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ انہیں اس زمانے میں غلام، اور دورِ حاضر میں محنت کش یا مزدور کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوعِ انسان کی تاریخ میں وہ دن سیاہ ترین تھا جب ایک غلام نے اپنے آقا کے لئے اس سے زیادہ پیدا کر دیا جتنا اس پر خرچ آتا تھا۔ اس دن نظامِ سرمایہ داری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔ اس کے بعد یہ روش اس طرح پھیلی اور مستحکم ہوئی کہ آقا اور غلام کا یہ فرق، فطرت کا تقاضا اور خدا کا منشاء تسلیم کیا جانے لگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف منظم فکرِ انسانی کا ابوالآباء افلاطون (PLATO)

انسانوں کی جو طبیعی تقسیم کرتا ہے تو اس میں ایک طبقہ غلاموں کا قرار دیتا ہے۔ یہی نظریہ ارسطو کا بھی تھا۔ دوسری طرف ہم قدیم ہندو مذہب کو دیکھتے ہیں تو اس میں برہما کے پیدا کردہ ورنوں (ذاتوں) کی تقسیم میں شودر (محنت کش) سب سے نچلے درجے میں رکھے جاتے ہیں اور اسے دھرم کا تقاضا اور خدا کا فیصلہ قرار دیا جاتا ہے۔ ابتداء میں جب ہر فرد، یا خاندان، اپنے لئے آپ خوراک پیدا کرتا تھا تو وہ اتنا رقبۂ زمین ہی اپنی تحویل میں رکھتا تھا جتنے پر وہ محنت کر سکے، یا جو اس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہو۔ بعد میں، جب اس نے غلاموں (محنت کشوں) سے کام لینا شروع کیا تو ان رقبوں کو بھی وسیع کرنا شروع کر دیا۔ اس سے وسائلِ رزق پر ذاتی ملکیت کے تصور نے جنم لیا اور میری اور تیری کی تفریق و تمیز وجود میں آ گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جن لوگوں نے زمین کے وسیع رقبوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا ان کے پاس ان کی ضروریات سے زائد سامانِ زیست جمع ہو گیا اور اسی نسبت سے وہ کمزور ان کے تابع فرمان ہوتے گئے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ان کے محتاج تھے۔ اسی سے باہمی رقابتوں، کشمکشوں، آویزشوں، فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جسے قرآن کریم نے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے۔ انسانوں کے یہ باہمی تصادمات افراد سے آگے بڑھ کر خاندانوں، خاندانوں سے قبیلوں، قبیلوں سے نسلوں اور نسلوں سے قوموں تک پہنچے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں آج انسان اس حالت میں کھڑا ہے کہ اس کا جسم لہو لہان اور اس کی ہڈیاں چور چور ہو چکی ہیں اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ـــــ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ انسانی فکر نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی جس قدر کوشش کی، یہ اور الجھتا گیا۔ اس کی اس وقت تک کی کاوشوں کے سلسلۂ دراز کی آخری کڑی وہ نظریہ، تحریک یا نظام ہے جسے کمیونزم یا سوشلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اس نظریہ یا نظام پر تفصیلی گفتگو کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم، مغربی مفکرین کی ان کوششوں پر طائرانہ سی نگاہ ڈال لی جائے جو اس باب میں اس سے پہلے کی گئیں تاکہ اس پس منظر میں، یہ نظریہ زیادہ اجاگر ہو کر سامنے آ سکے۔

مغربی مفکرین کی کوشش

ہم نے بات شروع کی تھی یونانی مفکر افلاطون سے۔ اس لئے کہا کہ اس فساد کا سرچشمہ زمین کی غلط تقسیم ہے اس کا حل اس نے یہ بتایا کہ ہر فرد کو زمین کا ایک ٹکڑہ دے دیا جائے جو مستقل طور پر اس کی تحویل میں رہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے صرف ایک وارث کی طرف منتقل ہو۔ اس زمین کی پیداوار اس فرد کے خاندان کی مشترکہ ضروریات پوری کرے۔ بالفاظِ دیگر اس نے اشتراک (کمیونزم) کا تصور تو دیا، لیکن جہاں تک زمین کا تعلق تھا اُسے محدود رکھا خاندان تک۔ لیکن اس نے کاشتکاروں کے ان خاندانوں کو امورِ مملکت میں دخل انداز نہیں ہونے

دیا۔ حکومت کو اس نے مفکرین اور شمشیر زنوں تک محدود رکھا۔

افلاطون کے شاگرد، ارسطو نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور کہا کہ مشترکہ ملکیت میں کم از کم چیزیں رکھی جائیں اور زیادہ سے زیادہ چیزیں افراد کی ذاتی ملکیت میں دیدی جائیں۔

لیکن افلاطون کا نظریہ تھا یا ارسطو کا، یہ دونوں ناکام رہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں، غلاموں (محنت کشوں) کے وجود کو فطرت کا منشاء اور انسان کی تمدنی زندگی کا لازمی تقاضا قرار دیتے تھے۔ اسی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انسان بدستور دو گروہوں میں بٹے رہے — ایک طبقہ پیدا کرنے والوں کا، اور دوسرا ان کی کمائی پر زندگی بسر کرنے والوں کا، جنہیں قرآن کریم مترفین کہہ کر پکارتا اور انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیتا ہے۔

اب ہمیں آگے بڑھ کر سولھویں صدی کے یورپ میں پہنچ جانا چاہیئے۔ جب اس مسئلہ (یعنی معاشیات) نے ایک الگ اور مستقل شعبۂ علم کی حیثیت اختیار کی تھی۔ اس وقت وہاں وہ معاشی نظام رائج تھا جسے عام طور پر مرکنٹلزم (MERCANTALISM) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ نظام وہاں اٹھارویں صدی تک رائج رہا۔ اسے بہ حیثیت ایک معاشی نظریہ کے سب سے پہلے اٹلی کے ایک صاحبِ قلم (SERRA) نے ۱۶۰۳ء میں پیش کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یونان کی تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے بعد یورپ میں (HUMANISM) کا دور دورہ تھا۔ اس فلسفہ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ذاتی مفاد (SELF-INTEREST) کے سوا کوئی ایسا جذبہ نہیں جو انسان کو کسی کام کے لئے آمادہ کر دے۔ لہٰذا مفادِ خویش ہی وہ اصول ہے جو کاروبارِ حیات میں حرکت پیدا کرتا اور اسے رہنمائی دیتا ہے۔ اور مفادِ خویش کا تحفظ ذاتی ملکیت کے سوا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس فلسفہ کا ایک نامور موید ہابز تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ انسان کو حیوانات پر شرف اور امتیاز ہی اس لئے حاصل ہے کہ اس کے ہاں ذاتی ملکیت کا تصور ہے۔ مرکنٹلزم کے معاشی نظام کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوئی۔ لیکن انہوں نے ذاتی ملکیت کے تصور کو آگے بڑھا کر، قومی ملکیت تک پہنچا دیا اور کہا کہ مملکت کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسری قوموں سے اس طرح تجارت کرے کہ ان کی دولت کھنچ کر اپنی قوم کی ملکیت میں آجائے۔ آپ نے دیکھا کہ اس معاشی نظام کی بنیاد خالصتاً مادیت یعنی مفادِ خویش پر ہے، خواہ وہ مفاد ایک فرد کا ہو یا ایک قوم کا۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ دوسروں پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا نام (CAPITALISM) یا نظامِ سرمایہ داری ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں اس نظریہ کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا اور فرانس کے مفکرین کے ایک گروہ نے ایک اور نظام کا نظریہ پیش کیا جو (PHYSIOCRACY) کی اصطلاح سے متعارف ہوا۔ اس کے معنی ہیں "فطرت کی حکمرانی" بنیادی طور پر اس کا مفہوم یہ تھا کہ نظام وہی صحیح قرار پا سکتا ہے جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، فطرت کا عطا کردہ ہو۔ لیکن چونکہ

نہ فطرت کا کوئی متعین مفہوم ان کے سامنے تھا، نہ نظامِ فطرت کا، اس لئے ان کا اولین مطالبہ یہ تھا کہ فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہونی چاہیئے اور حکومت کو اس کے معاملات میں کم از کم دخیل۔ اسی نظریہ کو عدم مداخلت یا (LAISSEZ - FAIRE) کہا جاتا ہے۔

جہانتک اس کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ ان کے ایک مشہور راہنما (TURGOT) کا وضع کردہ ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے، معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے —— ایک طبقہ پیدا کرنے والوں کا، اور دوسرا طبقہ "بانجھ"۔ اس کے نزدیک پیدا کرنے والا طبقہ صرف کاشتکاروں کا ہے۔ باقی لوگوں کی زیست کا دارومدار اس پیداوار پر ہے جو کاشتکار کی ضروریات سے زائد ہو۔ چنانچہ ان کے ہاں کا مشہور مقولہ ہے۔ "غریب کاشتکار، غریب مملکت، غریب بادشاہ"۔

ان کے نزدیک، معیشت کا بہترین نظام، مبادلۂ اشیاء (BARTER SYSTEM) ہے۔ ایک شخص کے پاس گیہوں ہے لیکن اسے ضرورت تیل کی ہے۔ دوسرے کے پاس تیل ہے، اور اسے گیہوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ گیہوں اور تیل کا باہمی تبادلہ کر لیتے ہیں، اور اس طرح دونوں کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس اتنا تیل فالتو ہے جتنے کی کسی کو ضرورت نہیں، تو اس کے لئے اس فاضل جنس (تیل) کا سنبھال کر رکھنا ایک مسئلہ ہو جائے گا۔ ان کی تحقیق کی رو سے، اس مسئلہ کے حل کے لئے چاندی سونے کے ٹکڑوں کو استعمال میں لایا گیا۔ اس طرح "سِکّہ" کا وجود عمل میں آیا۔ شروع شروع میں لوگ، ایک دوسرے سے مانگ کر سکوں کو استعمال کر لیتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ — سکّے کے مالکوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ہم اپنے سکے، دوسروں کے استعمال کے لئے مفت کیوں دے دیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کے استعمال (USE) کا معاوضہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا نام سود یا (USURY) تھا۔ ترگوٹ کے نزدیک بانجھ طبقوں میں بدترین طبقہ وہ تھا جو پیدا کچھ نہیں کرتا تھا اور دھات کے چند ٹکڑوں کے استعمال کے معاوضہ پر زندگی گذارتا تھا۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ پیداوار کے حقیقی سرچشمہ، یعنی کاشتکار کو معاشرہ میں بلند ترین مقام ملنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ حکام سے بھی برتر۔ وہ ان کا شمار بھی "بانجھ" طبقہ میں کرتا تھا۔

ممکن ہے (PHYSIOCRATS) کا نظریہ زیادہ پھیل جاتا لیکن عین اس زمانے میں سکاٹ لینڈ میں ایک مفکر پیدا ہوا جو دیگر تمام مفکرین پر چھا گیا۔ اس کا نام ہے ——

نظامِ سرمایہ داری

(ADAM SMITH) جس کی کتاب (THE WEALTH OF NATIONS) نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ یہ کتاب درحقیقت نظامِ سرمایہ داری کی بائبل ہے۔ اسمتھ کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ دولت کا سرچشمہ زمین نہیں، صنعت کاری (انڈسٹری) ہے۔ اس سے مغرب کے نظام کارخانہ داری کی بنیاد پڑی۔ وہ کہتا ہے کہ جو قوم ایسی چیزیں تیار کرے جن سے دوسرے لوگوں کی ضرورتیں بڑھتی جائیں، اس کے پاس دوسروں کی دولت کھنچی

چل آئے گی۔ وہ فرد کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی پابندی کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کا نظام خالصتہً مادہ پرستانہ ہے۔ اس کے سامنے کوئی اخلاقی تصور نہیں۔ اسمتھ کے متبعین میں بینتھم، مالتھوس، ریکارڈو وغیرہ نے اس کے نظریہ کو مزید تقویت پہنچائی، اور یورپ میں نظامِ سرمایہ داری آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس نظام نے محنت کشوں کے خون چوسنے کے جذبہ کو کس حد تک شدید اور ناقابلِ تسکین بنا دیا تھا اس کا اندازہ اس دور کے لٹریچر سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ مثلاً (DEFOE) نے ۱۷۰۴ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں لکھا کہ "غریبوں کی مدد بالکل نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ان کی مدد کی گئی تو وہ سہل انگار ہو جائیں گے اور اگر انہیں سرکاری اداروں میں کام پر لگایا گیا تو اس کا اثر پرائیویٹ اداروں پر بہت بُرا پڑے گا۔ اس لئے انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ اپنا رزق آپ تلاش کریں اور کام نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد (MANDEVILLEE) نے اپنی کتاب (FABLE OF THE BEES) شائع کی جس کا محض یہ تھا کہ:-

> غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انہیں محتاج رکھا جائے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز کر دینا حماقت ہے۔ سوسائٹی کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تباہ حال اور مفلس رہے۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں برطانیہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دیہی آبادی کو کس طرح مجبور کیا جائے کہ وہ شہروں میں آکر کارخانوں میں مزدوری کریں۔ اس باب میں (WILLIAM TOWNSEND) نے ۱۷۸۵ء میں اپنی کتاب (DESSERTATION ON THE POOR LAWS) میں لکھا کہ:-

> بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تندخو سے تندخو جانور کو بھی رام کر دیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان بھی مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک ـــــ بھوک ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

یہ تھی وہ فضا جسے نظامِ سرمایہ داری نے پیدا کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ فضا عام ہو چکی تھی

ردِ عمل

لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں کچھ انسان تو ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کے سینے انسانی جذباتِ ہمدردی سے یکسر خالی نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ وہاں بھی ایسے انسان پیدا ہوئے۔ غریبوں اور ناداروں کے خلاف نظامِ سرمایہ داری کی اس شدت نے، اس قسم کے

انسانوں کے جذباتِ ہمدردی کو بیدار کر دیا۔ ان میں سب سے پہلے ہمارے سامنے (SAINT SIMON) آتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ محنت کش طبقہ کی جسمانی اور تعلیمی حالت میں خوشگوار تبدیلی پیدا کی جائے اور معاشرے کی ازسرِنو تنظیم اس طرح کی جائے کہ تمام افراد کام کریں، اور کوئی شخص بیکار بیٹھ کر دوسروں کی محنت پر زندگی بسر نہ کرے۔ اس کے متبعین میں بعض گرجا کے بھی تھے، جو چاہتے تھے کہ سرمایہ دار طبقہ کو یکسر مٹا دیا جائے اور مزدوروں میں زیادہ سے زیادہ اشتراکیت اور اجتماعیت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت رابرٹ اوون (ROBERT OWEN 1771-1858) کی ہے۔ اس کی فکر کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ اپنا کیریکٹر خود نہیں بناتا۔ اس کا معاشرہ اس کا کیریکٹر متشکل کرتا ہے۔ اوون ایک نظری مفکر ہی نہیں تھا، عملی مصلح تھا۔ چنانچہ اس نے گلاسگو کے قریب مزدوروں کے لئے ایک کارخانہ قائم کیا۔ اس کے پاس ہی ان کی ایک بستی بسائی۔ ان کے لئے عمدہ رہائش گاہیں تعمیر کیں۔ مدرسے کھولے۔ ان کے حفظانِ صحت کا انتظام کیا۔ وہ کہتا تھا کہ سرمایہ دار کے لئے پانچ فی صد سے زیادہ منافع نہیں ہونا چاہیئے۔ باقی سب مزدوروں کی بہبود پر صرف ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہونی تھی، سو ہوئی اور بڑی شدت کے ساتھ ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ پاگل ہے اور وہ کہتا تھا کہ یہ سب پاگل ہیں — جوں جوں اس کی مخالفت بڑھتی گئی وہ اور متشدد ہوتا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے مذہب کی بھی مخالفت شروع کر دی۔ وہ کہتا تھا کہ اس قسم کے تمام باطل نظریوں کا ذمہ دار مذہب ہے۔ اس سے اس کے دوستوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا — یہ نظریہ اوون ہی کا ہے کہ انسان کی ترقی کے راستے میں تین بڑے بڑے موانع ہیں۔ ذاتی جائداد، مذہب اور شادی۔ اس کا خیال تھا کہ صحیح اشتراکی زندگی میں ان تینوں کو مٹا دینا ہوگا۔

اسی قسم کا ایک اشتراکی لیفارمر فرانس کا رہنے والا لوئی بلان (LOUIS BLANC) تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ہر فرد کے لئے کام مہیا کرے، اور یہ کہ مزدوروں کو ان کی محنت کے مطابق ہی معاوضہ نہیں ملنا چاہیئے، بلکہ اتنا زیادہ ملنا چاہیئے جس سے ان کی تمام ضروریات زندگی پوری ہو جائیں۔

اس جماعت کا ایک اور ممتاز فرد پرادھن (PROUDHAN 1809-1865) تھا۔ یہ درحقیقت مارکسی اشتراکیت کا طائر پیش رس تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جائداد درحقیقت چوری ہے اور جائدادوں کے مالک سب چور ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ جائداد اس طرح بنتی ہے کہ دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں اور ان کی محنت کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ زمین کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہ فطرت کا عطیہ ہے جس پر ملکیت کا کسی کو حق نہیں۔ نہ ہی اسے بٹائی یا پٹہ پر دیا جا سکتا ہے۔ اس سے صرف انسان کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔

کارل مارکس

یہ تھا وہ ماحول جس میں کارل مارکس نے آنکھ کھولی، اور یہ تھے وہ اشتراکیین جنہوں نے مارکس کے لئے زمین ہموار کی۔ مارکس بالخصوص رابرٹ اوون سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ چنانچہ (COLE) جس نے اوون کے سوانحیات مرتب کئے ہیں، لکھتا ہے کہ اشتراکیین کے نزدیک، نظریۂ اشتراکیت مارکس کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا مصنف اوون ہے۔ بلکہ ہم کہیں گے کہ اس کا سہرا، اس سے زیادہ پرادھن کے سر ہے۔ بہرحال، یہ تھے وہ مارکس کے پیشرو جن کی فکر سے وہ بہت متاثر تھا۔

کارل مارکس (1818-1883) یہودی النسل، جرمنی کا باشندہ تھا۔ برلن یونیورسٹی میں وہ ہیگل کے فلسفہ سے متاثر ہوا، اور یہی اس کے معاشی فکر کی بنیاد بنا۔ شروع شروع میں اس نے جرمنی ہی میں اپنی فکر کی اشاعت کی، لیکن وہاں کی فضا سازگار نہ رہی تو وہ پیرس چلا آیا۔ وہاں اس کی ملاقات فریڈرک انجلز سے ہوئی جو اس کی فکر کا بہت بڑا ستون ثابت ہوا۔ وہیں یہ پرادھن سے بھی ملا اور اس کے خیالات سے بہت متاثر ہوا۔ اسے پیرس سے نکال دیا گیا تو یہ برسلز چلا گیا اور اس کے بعد لندن، جہاں سے اس کی مشہور کتاب سرمایہ (CAPITAL) شائع ہوئی جس نے معاشی فکر کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں، جہاں مارکس کا فلسفہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن میں آپ کو فلسفہ کی گتھیوں میں الجھانا نہیں چاہتا، بالخصوص اس لئے کہ ہمارے پیش نظر موضوع سے اس کا بہت کم تعلق ہے۔ عام فہم الفاظ میں، مارکس کے فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ:-

مارکس کا فلسفہ

(۱) کائنات میں تغیر کا عمل مسلسل جاری ہے۔ یہاں نہ کوئی نظریہ، تصور یا عقیدہ غیر متبدل ہے، نہ کوئی نظام مستقل۔ یہاں ہر شے تغیر پذیر ہے۔

(۲) دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک اور نظام اس کی جگہ لے لیتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ پھر اس نظام کی جگہ ایک اور نظام لے لیتا ہے، جو اس کی بھی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلۂ تغیرات و اضداد، ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

(۳) اس وقت نظام سرمایہ داری رائج ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کی جگہ ایک اور نظام لے لے جو اس کی ضد ہو۔ یہ نظام، اشتراکیت پر مبنی ہوگا۔

جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی قوت ہے جو سلسلۂ تغیرات و اضداد کو اس نظم و ضبط کے ساتھ وجود میں لاتی ہے، تو اس نے کہا کہ یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی قوت سے ہوتا ہے۔ "تاریخی وجوب" ایک ایسی اصطلاح ہے جو آجتک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکی۔ (NECESSITY) یا وجوب کے معنی ہوتے ہیں ایسی بات جو بہرحال ہو کر رہے۔ اسے (HISTORICAL DETERMINISM) بھی کہتے ہیں۔ یعنی تاریخی جبریت۔ اس کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، ایسا بہرحال ہو کر رہتا ہے۔ کوئی قوت اُسے روک نہیں سکتی۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری کے لئے اب یہ مقدّر ہے کہ وہ مٹ جائے اور اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے لے جو اس کی ضد ہو۔ اس سے ایک بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے اور وہ یہ کہ مارکس بھی اپنے پیشروؤں کی طرح اپنے سینے میں دلِ دردمند رکھتا تھا۔ اس لئے چاہتا تھا کہ وہ نظام جس نے انسانیت پر اس قدر ظلم و تشدد روا رکھے ہیں، کسی نہ کسی طرح مٹ جائے۔ اس تغیر کے لئے اسے کوئی ایسی اساس نہیں مل سکی جو دلیل و برہان (REASON) پر مبنی ہو، اس لئے اس نے نظریۂ جبریت کے سایہ میں پناہ لے لی، حالانکہ یہ نظریہ ایک ایسی مبہم اندھی قوت کے تصوّر پر مبنی ہے جس کے سامنے، عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک — علامہ اقبال نے مارکس کے اس اندرونی تضاد کو ایک مصرعہ میں واشگاف کر دیا ہے، جب کہا ہے کہ — قلبِ او مومن، باطنش کافر است — وہ سینے میں دل تو دردمند رکھتا تھا، لیکن اس کی سوچ غلط تھی۔ اس سلسلہ میں مہاتما بُدھ کی بین مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے اپنے معاشرہ پر نظر ڈالی تو اس میں بے شمار اندھے، لولے، لنگڑے، کوڑھی، اپاہج دکھائی دیئے۔ وہ ایک ریاست کے ولی عہد تھے۔ اگر ان کی فکر صحیح ہوتی تو وہ لوگوں کے ان مصائب کے حقیقی اسباب کی تحقیق کرتے، اور اس تحقیق میں انہیں نظر آجاتا کہ اس کی ذمہ داری خود ان کی ریاست کے نظام پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن ان کی سوچ صحیح نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ دنیا ہے ہی مصیبتوں کا گھر، اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اسے تیاگ کر انسان جنگلوں میں چلا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ اس غلط سوچ نے نوعِ انسان کو کس قدر تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی جو دو اڑھائی ہزار سال سے دنیا کی اس قدر کثیر آبادی کے اعصاب پر مسلط چلا آ رہا ہے اور جس نے انہیں شل کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اوون کا نظریہ یہ تھا کہ نظامِ سرمایہ داری مذہب کا پیدا کردہ ہے اس لئے اس نظام سے رستگاری کے لئے مذہب کا مٹا دینا ضروری ہے۔ مارکس انہی فلاسفروں سے متاثر تھا اس لئے وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچا اور اس نے بھی یہی کہا کہ نظامِ سرمایہ داری کا تختہ اُلٹنے کے راستے میں مذہب سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لئے اس کا راستے سے ہٹانا از بس ضروری — سوال یہ ہے کہ وہ اس نتیجہ پر کس طرح پہنچا۔ اور اس کا جواب نہایت آسان اور پیش پا افتادہ ہے۔ وہ یہودی النسل تھا اور یہودیوں کی صدیوں سے یہ حالت چلی آ رہی تھی کہ وہ دنیا کی ذلیل ترین قوم بن کر رہ گئے تھے نہ صرف یہ کہ ان کی کہیں اپنی حکومت نہ تھی، ان کے رہنے کا ٹھکانہ تک بھی کوئی نہیں تھا۔ انہیں کہتے ہیں (THE WANDERING JEWS) دشت پیما، خانہ بدوش قوم تھے۔ اور ان کی اس حالت کا ذمہ دار وہ مذہب تھا جسے وہ اس تقدس سے سینے کے ساتھ لگائے پھرتے تھے۔ مارکس

سب سے پہلے اس مذہب سے متنفر ہوا۔ اس کے بعد اس کے سامنے عیسائیت آئی۔ یہ وہ مذہب تھا جس کے انسانیت کُش نتائج سے تنگ آ کر خود عیسائی بھی چلا اٹھے تھے۔ مشہور مؤرخ اور مفکر رابرٹ بریفو اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے :-

> عیسائیت کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری تاریخ میں ہمیشہ استبداد کا ساتھ دیا ہے اور اسے تقویت پہنچانے کا ذریعہ بنی ہے۔ سوائے ان حالات کے جن میں خود کلیسا کا مفاد غریبوں کے مفاد کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا، اس نے کبھی اپنا اثر و قوت کمزوروں کی آزادی اور مستبد قوتوں کی روک تھام کے لئے صرف نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے ہمیشہ جور و ستم اور جبر و استبداد کی حمایت کی ہے۔

اس کے بعد بریفو، ہسپانیہ کے پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے :-

> عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس تصورِ اخلاق کے دائرے سے یکسر باہر کی چیز ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں۔ لیکن خود ظلم و ستم کی طرف سے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے ..... ذرا سوچئے کہ سینٹ و نسنٹ ڈی پال کے اس قیدخانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے اور گنہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے اس کا اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں۔ انسانوں کی زندگیاں اور قلوب شادمان، غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں۔ ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں۔ وہ مٹ جائیں، فنا ہو جائیں۔ عیسائیت فقط اتنا کرے گی کہ انہیں تسلی کی تھپکیاں دیتی رہے گی۔ لیکن اس کے حیطۂ تصور میں کبھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے، ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی۔ (PP - 332 - 333)

یہ تھا وہ مذہب جس کے متعلق اس سے پہلے جرمن فلاسفر نیٹشے نے چیخ کر کہا تھا کہ "مجھے اس کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے اور اسے اصلی معنوں میں صلیب دینا پڑا"۔ یہی تھا وہ مذہب جس کے خلاف اوون نے صدائے احتجاج بلند کی اور اس سے مارکس متاثر ہوا۔ ہیگل کا ایک اور شاگرد تھا۔

(FEURBACH) اس نے اپنی کتاب (ESSENCE OF CHRISTIANITY) میں عیسائیت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں تھیں۔ یہ انجلز اور مارکس کا بڑا محبوب تھا۔ انہوں نے "مذہب عوام کے لئے افیون ہے" کا نظریہ اسی سے مستعار لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہب تھا ہی ایسا جس کے خلاف ہر دلِ دردمند، سراپا نالہ اور ہمہ تن انقلاب بن جاتا۔ لہٰذا اگر مارکس نے بھی اس کی مخالفت کی تو اس میں وہ حق بجانب تھا۔ البتہ اس کے جذبات کی شدت اور سوچ کی غلطی یہ تھی کہ وہ بجائے اس کے کہ وہ اس مذہب یا اسی جیسے دیگر مذاہب کی مخالفت کرتا، اس نے مستقل اقدار، غیر متبدل اصولِ حیات اور قانونِ مکافاتِ عمل ہی سے انکار کر دیا — انہی کے انکار کو خدا — وحی اور آخرت کے انکار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

> اخلاق۔ مذہب۔ مابعد الطبیعیات اور اسی قسم کے دوسرے تصورات اپنا آزاد وجود کہیں نہیں رکھتے۔ نہ ان کی کوئی تاریخ ہے، نہ نشو و نما۔ بجز اس کے کہ انسان جب اپنے معاشی ذرائع کو نشو و نما دیتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے افکار و تخیلات کو بھی بدلتا رہتا ہے۔ (انہی کا نام اخلاق اور مذہب ہے) (دی نیپیٹل)

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک اتنے بڑے مفکر سے، جس کی فکر نے نوعِ انسان کے ایک کثیر حصہ کو متاثر کیا اور نہ معلوم کب تک کرتے چلے جانا تھا، یہ توقع کرنا کچھ زیادتی نہیں ہوگا کہ اس نے جہاں یہودیت، عیسائیت اور (شاید) بدھ مت جیسے مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نتیجہ اخذ کیا تھا، دنیا کا ایک ایسا ہی عظیم مذہب (اسلام) اس کے سامنے تھا۔ اسے چاہیئے تھا کہ وہ اسے بھی سمجھنے کی کوشش کرتا۔ ایسا کرنا اس کے لئے چنداں مشکل بھی نہیں تھا، کیونکہ اس مذہب کا ضابطۂ حیات قرآن مجید، دنیا کے کونے کونے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ اگر خالی الذہن ہو کر قرآن کریم کا مطالعہ کر لیتا تو ہمیں یقین ہے کہ اس کی فکر اس قدر تخریبی راستے اختیار نہ کرتی، لیکن افسوس ہے کہ اس نے ایسا نہ کیا۔ اس کے لٹریچر میں کہیں قرآن کا نام تک دکھائی نہیں دیتا۔ وہ جذباتی انسان تھا، اپنے جذبات کی شدت کی رَو میں بہہ گیا۔ اس سے انسانیت کو کس قدر نقصان پہنچا، اسے تو چھوڑیئے۔ اس سے خود اس کا وہ نظام جس کے لئے اس نے اس قدر سختیاں جھیلیں اور معاشی برداشت کئے تھے، گونگے کا خواب، شاعر کی تخیلاتی جنت (UTOPIA) اور ناممکن العمل فلسفہ بن کر رہ گیا۔ تفصیل اس اجمال کی ابھی سامنے آتی ہے:-

مارکس کا معاشی نظام

مارکس نے کہا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل وہ معاشی نظام ہے جس میں:-

(۱) ذرائع پیداوار ذاتی ملکیت کی بجائے معاشرہ کی مشترکہ تحویل میں رہیں — اور

(۲) جس میں ہر فرد اپنی اپنی استعداد کے مطابق، جان مار کر محنت کرے، اس کی محنت کا ماحصل، معاشرہ کی مشترکہ تحویل میں رہے جہاں سے ہر فرد کو اس کی

ضروریات کے مطابق ملتا جائے۔ اس طرح نہ کوئی فرد اپنی ضروریات سے محروم رہے گا اور نہ کسی کے پاس اس کی ضرورت سے زائد باقی بچے گا۔

اس پر، اس کے رفقاء جوشِ مسرت سے اچھل پڑے۔ انہوں نے "پالیا، پالیا" کے شور سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ابنِ آدم کو اب وہ جنت مل ہی جاتی ہے، جسے اس نے کھو دیا تھا، اور جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے آشفتہ پا ژدہ و اہیں سو ماندہ، مارے مارے پھر رہا تھا۔ جب ان کے جذبات کی شدت میں کمی واقع ہوئی تو انہوں نے مارکس سے کہا کہ آپ کے پیش کردہ فارمولا کی شقِ اوّل پر تو خیر، کسی نہ کسی طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ معاشرہ قوت فراہم کرلے تو وہ ذرائع پیداوار کو، ان کے موجودہ مالکوں کے ہاتھوں سے چھین کر اسے اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کی شقِ دوم پر کس طرح عمل کیا جا سکے گا۔ یعنی اس شق پر کہ ہر شخص جان مار کر محنت کرے۔ اور اس کے ماحصل سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے۔ باقی دوسروں کیلئے چھوڑ دے اس کا اتنا حصہ تو قابلِ فہم ہے کہ جن لوگوں کی ضروریات ان کی محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتیں، وہ اس نظام پر لبیک کہہ دیں گے، اگرچہ وہ بھی رفتہ رفتہ اپنی محنت کو کم کر دیں گے۔ کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ان کی تمام کی تمام ضروریات معاشرہ کی طرف سے پوری ہوتی ہیں تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ جان مار کر محنت کریں ــــ لیکن یہ بات تو قطعاً سمجھ میں نہیں آتی کہ جن لوگوں کی محنت کا ماحصل بہت زیادہ ہوگا اور ضروریات کم، وہ اس نظام کی طرف کیوں آئیں گے۔ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہوگا، جس کی رو سے وہ جان مار کر محنت کریں ــــ اور ایک آدھ دن ہی ایسا نہ کریں، عمر بھر ایسا کرتے رہیں۔ اور اس میں سے کم از کم لیں۔ باقی سب دوسروں کے لئے چھوڑ دیں ــــ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہوگا جو انہیں اس پر آمادہ کر دے گا اور استقامت سے اس پر مسلسل چلاتا رہے گا، ہمیں یہ سمجھا دیجئے۔

مارکس کا عجز

اور مارکس کا جواب یہ تھا کہ یہ بات خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ اس پر تو میرا ایمان ہے کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل یہی ہے۔ لیکن یہ ممکن العمل کیسے ہوگا؟ اس کے لئے جذبۂ محرکہ کیا ہوگا؟ یہ میں نہیں بتا سکتا۔ مارکس کی تحریریں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ وہ ان کے مسلسل تقاضوں سے جھلا اٹھتا۔ وہ انہیں (UTOPIANS) خوابوں کی دنیا میں رہنے والے پکارتا، اور ان سے کہتا کہ وہ اس بحث کو نہ چھیڑا کریں۔ ان کی پارٹی میں مارکس کے بعد، دوسرے نمبر پر لینن آتا تھا۔ وہ اس کی طرف رجوع کرتے تو وہ بھی اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ:

نوعِ انسان کن مراحل سے گزر کر اور کن عملی اقدامات کی رو سے اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی، اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں۔

یہ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی مواد ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جا سکے ..... ایسا کچھ صرف رضامندانہ ہو سکتا ہے۔ کمیونزم میں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن یہ ہوگا کیسے، اس کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔
(MARX, ENGELS MARXISM ; BY LENIN PP 355-56)

یہ ہے وہ مقام جہاں مارکس ناکام رہ گیا — اور یہ اس لئے کہ جن حقیقتوں سے اُسے اس سوال کا جواب ملنا تھا، ان سے اس نے انکار کر دیا تھا۔ یہ نتیجہ تھا اس کی "کافر دماغی" کا — اور مارکس ہی نہیں، یہ وہ مقام ہے جس پر آج بھی کمیونزم کا ہر داعی اسی طرح، ششدر و حیران، اور خاسر و ناکام کھڑا ہے۔ ان میں سے بھی کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوگا، اور کیسے پیدا ہوگا جس کی رو سے کمیونزم کا نظام ممکن العمل قرار پا سکے گا۔

سوشلزم

مارکس اور اس کے رفقاء کی یہی ناکامی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے طے کیا کہ ہمیں کمیونزم کے نظام کو چھوڑ سردست اس فارمولا کی شقِ اوّل کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یعنی اس شق پر عمل پیرا ہونے کی کہ ذرائع رزق ان کے موجودہ مالکوں کے ہاتھ سے چھین کر اسٹیٹ کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اسے سوشلزم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ مارکس کے رفقا نے کہا تھا، اس شق پر قوت اور تشدد کی رو ہی سے عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو سوشلزم اور تشدد لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ لینن اپنی کتاب (STATE AND REVOLUTION) میں انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے لکھتا ہے:۔

انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصّہ دوسرے حصّہ پر اپنا اختیار و تسلّط، قوت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی قائم کرتا ہے۔

سوشلزم میں نظامِ حکومت کس قسم کا قائم ہوگا، اس کے متعلق مارکس لکھتا ہے:۔

نظامِ سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان، عبوری دَور میں وہ طریق کار فرما ہوگا جس کی رُو سے اوّل الذکر، ثانی الذکر میں بتدریج تبدیل ہوگا۔ اسی نسبت سے اس عبوری دَور (یعنی سوشلزم) میں سیاسی نظام بھی عبوری قسم کا رائج ہوگا۔ اس میں اسٹیٹ محنت کشوں کی ڈکٹیٹرشپ کا نام ہوگا۔ (لینن ص۳۴۶)

اس ڈکٹیٹرشپ کے متعلق سٹالن اپنی کتاب لینن ازم میں لکھتا ہے:۔

ڈکٹیٹر ایک ایسی مختار عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود یکسر قوت پر قائم ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سن لیں، اور اچھی طرح سن لیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں قوتِ غیر محدود اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور

قانون و شریعت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔

یہ ڈکٹیٹرشپ، عام افراد معاشرہ ہی کو جبر و اکراہ سے اپنے قابو میں نہیں رکھے گی۔ خود اپنی پارٹی کا ڈسپلن بھی اسی انداز سے برقرار رکھے گی۔ انقلابِ روس ۱۹۱۷ء میں عمل میں آیا اور لینن نے ۱۹۲۰ء میں کہا کہ:

> اس حقیقت کو اب ہر ایک نے محسوس کر لیا ہوگا کہ بالشویک، اڑھائی سال تو ایک طرف، اڑھائی ماہ تک بھی برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتے تھے، جب تک ہماری پارٹی میں متشدد اور صحیح معنوں میں فولادی ڈسپلن قائم نہ رکھا جاتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ مارکسی نظریہ کی رو سے، سوشلزم کا قیام تشدد اور قوت کے بغیر ناممکن ہے یہ تشدد اور قوت خود پارٹی کے اندر بھی کارفرما رہے گا، اور یہ سب کچھ ڈکٹیٹر کے قاہرانہ اختیارات کی رو سے ہوگا — تشدد ہی نہیں بلکہ اس میں کسی قسم کے ضابطۂ اخلاق کی بھی پابندی نہیں ہوگی۔ لینن نے ۱۹۲۰ء میں یونین کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانگرس میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت سرچشمہ (یعنی وحیٔ خداوندی) یا غیر طبقاتی تصوّر کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصوّر فریب ہے۔ یہ تصوّر، زمینداری اور سرمایہ داری کے مفاد کی حفاظت کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطۂ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکام خداوندی پر مبنی ہے۔ (ہم اس تصوّر کو ٹھکراتے ہیں) ہم خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔ اخلاق، انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس کے ماورا جو کچھ ہے، فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔ (مارکس۔ انجلز۔ مارکسزم ۶۵-۱۹۶۱ء)

جس طرح ہم تشدد کے متعلق بتا چکے ہیں کہ وہ برسرِ اقتدار پارٹی (یا ڈکٹیٹرشپ) کی طرف سے عوام پر ہی روا نہیں رکھا جائے گا بلکہ خود اپنی پارٹی میں بھی اپنی آہنی زنجیروں کے ذریعے ڈسپلن قائم رکھا جائے گا۔ اسی طرح جھوٹ، فریب دہی، اور دیگر اخلاق حمیدہ شکنی بھی، عوام تک ہی محدود نہیں رکھی جائے گی۔ پارٹی کے اندر بھی یہی روش رہے گی۔ (GOLLANCZ) نے اپنی کتاب (OUR THREATEND VALUES) میں لکھا ہے کہ جب مشہور اشتراکی راہ نما —

(DR. G. LUCKNZ) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے افراد سے بھی جھوٹ اور فریب دہی سے کام لیں، تو اس نے کہا۔

> اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی ہے جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ وہ انتہا ہے۔ جن پر ٹھگوں اور ڈاکوؤں کے گروہ بھی نہیں پہنچے تھے۔ ان کا اپنا ایک آئین اور ضابطۂ اخلاق ہوتا تھا جس پر وہ پارٹی کے اندر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے۔ لیکن سوشلزم ایسا نظام ہے جو تشدد، جھوٹ، فریب، بددیانتی، عہد فراموشی میں، اپنے اور پرائے، کسی میں بھی تمیز نہیں کرتا۔ آپ جب کسی کمیونسٹ سے بات کریں اور اس سے کہیں کہ کیا یہ ہے وہ نظام جسے آپ نوعِ انسان کی بہبود کے لئے دنیا میں رائج کرنا چاہتے ہیں، تو وہ جواب میں کہہ دے گا کہ تشدد ہو یا اخلاق باختگی، اس سے معاشی عدل تو قائم ہو جائے گا۔ طبقاتی تقسیم کا تو خاتمہ ہو جائے گا۔ ہمیں ذرائع کو اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ اس مقصد کو اہمیت دینی چاہیئے جس کے حصول کے لئے وہ ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ (MEANS ARE JUSTIFIED BY THE END ACHIEVED) قطع نظر اس امر کے کہ جس میکیاولی مقولہ کو یہ لوگ اس طرح ایک حقیقت مسلّمہ کے طور پر پیش کر دیتے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہے ــــ سوشلزم میں، اس قسم کے انسانیت سوز اور حدود فراموش ذرائع سے وہ مقصد بھی حاصل نہ ہوا نہ ہی ہو سکتا ہے جس کے حصول کے لئے یہ ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے کمیونسٹوں میں شاید ہی ایسے ہوں (اور اگر ایسے ہوں گے بھی تو بہت کم) جنہوں نے کمیونزم یا سوشلزم کا علمی سطح پر مطالعہ کیا ہو۔ یہ بالعموم جذباتی ہوتے ہیں اور محض سنی سنائی باتوں کو دہراتے رہتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اور تو اور خود مارکس نے کہہ دیا تھا کہ سوشلزم کی رو سے معاشی عدل قائم نہیں ہو سکے گا۔ سنئے، اس نے اس باب میں کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ:۔

> لوگوں کی صلاحیتیں اور حالات مختلف ہیں۔ کوئی طاقتور ہے کوئی کمزور۔ کوئی شادی شدہ ہے کوئی مجرد۔ کسی کے بچے کم ہیں کسی کے زیادہ۔ لیکن سوشلزم کے اصول تقسیم کی رُو سے ایک کو زیادہ ملے گا دوسرے کو کم۔ لہٰذا ایک مقابلۃً امیر ہوگا، دوسرا غریب۔ اس لئے (لینن کے الفاظ میں) اس نظام میں مساوات اور عدل نہیں ہوگا۔ اس میں دولت کا تفاوت اور غیر منصفانہ تفاوت باقی رہے گا۔ (مارکس کے الفاظ میں) یہ اس نظام (سوشلزم) کا بہت بڑا سقم ہے۔ لیکن اس عبوری دَور میں (یعنی جب تک سوشلزم کا نظام قائم رہے گا)

یہ سقم باقی رہے گا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ (لینن صفحہ ۳۵۱-۵۴)

یہ ہے سوشلزم کا ماحصل خود مارکس اور لینن کے الفاظ میں ـــ اور اس کا ثبوت ہر وہ ملک پیش کر رہا ہے جہاں سوشلزم رائج کیا گیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یہ کہیں کامیاب نہیں ہو سکا۔ جس نظام میں طبقاتی تفاوت بدستور باقی رہے اور معاشی عدل قائم ہی نہ ہو سکے، اسے آپ کب تک ڈنڈے کے زور پر قائم رکھ سکیں گے۔ یہ حضرات جھٹ سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ دیکھئے! یہ نظام چین میں کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے؛ انہیں کون بتائے کہ چین میں یہ نظام اپنی خوبی کی وجہ سے نہیں چل رہا۔ یہ محض مآؤ کی شخصیت کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اس قوم نے اپنے اس سربراہ کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ وہ اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کی "لال کتاب" کو آسمانی صحیفہ سے بھی زیادہ مقدس سمجھتے ہیں۔ وہاں اس نظام کے چلنے کی وجہ مآؤ کی پرستش ہے۔ اس کے بعد دیکھئے گا کہ وہاں بھی کیا ہوتا ہے؟ یاد رکھئے! کوئی ایسا نظام جو محکم بنیادوں پر استوار نہ ہو اور محض شخصیتوں کے سہارے چل رہا ہو، کامیاب نہیں ہو سکتا ـــ سوشلزم کی بنیاد کوئی نہیں۔

مارکس سے آگے

سوشلزم کے متعلق یہ کچھ کہہ لینے کے بعد، ہم اس مقام کی طرف لوٹتے ہیں جہاں مارکس ناکام رہا ہے۔ ہم اس سے متفق ہیں کہ انسانیت کی معاشی مشکلات کا حل اسی اصول پر عمل پیرا ہونے میں ہے کہ:-

ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرے، اور اپنی ضروریات کے مطابق لے۔

لیکن مارکس کو وہ بنیاد نہیں مل سکی جس پر اس نظام کی رفیع الشان عمارت استوار ہو۔ وہ جذبہ نہیں مل سکا جو اتنے عظیم ایثار کا محرک بن سکے۔ لینن نے کہا تھا کہ ایسا کچھ صرف رضاکارانہ طور پر ہو سکے گا اور اس کے لئے جس جذبہ کی ضرورت ہے، ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیسے پیدا ہو سکے، اور کس طرح قائم رہ سکے گا یہی تھی وہ حقیقت جس کی طرف علامہ اقبال نے، انقلاب روس کے بعد اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

ایکہ می خواہی نظام عالمے — جستۂ او را اساس محکمے
داستان کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُم الکتاب

آیئے ہم دیکھیں کہ اُم الکتاب، وہ اساس محکم کس طرح مہیا کرتی ہے۔ اس اساس محکم کا نام ہے ایمان .....!

ہمارے ہاں کے (اور شاید باقی دنیا کے) کمیونسٹوں کی بھی کیفیت یہ ہے کہ جونہی ان کے سامنے ایمان یا خدا کا نام لیا جائے یہ ایک تحقیر آمیز تبسم، بلکہ استہزاد آلود قہقہہ سے اس کا استقبال کرتے اور اس قسم کے رٹے رٹائے فقرے بول کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ ایمان اندھی عقیدت کا نام ہے۔

جسے خوف سے پیدا کیا جاتا اور جہالت کے سہارے قائم رکھا جاتا ہے۔ اب اس قسم کی توہم پرستوں کا زمانہ نہیں رہا۔ ہم نے مفاد پرستوں کی کارگہ میں ڈھلے ہوئے ان تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ہے۔ (وغیرہ وغیرہ) وہ اس قسم کے الفاظ دہرا کر اپنی انقلاب پسندی کا رعب گانٹھنا یا علمیت کی دھاک بٹھانا چاہتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مارکس۔ اینجلز وغیرہ نے کم از کم عیسائیت کا تو مطالعہ کیا تھا، لیکن ان حضرات نے کسی مذہب کا بھی مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ ان کے مبلغ علم کا منتہی اسی قسم کی سنی سنائی باتیں ہوتی ہیں۔ ان حضرات کا سب سے بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ خدا کا وجود ثابت کیجئے —— اور "ثابت کیجئے" سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ انہیں بتایئے کہ وہ دیکھئے! سامنے پہاڑی پر خدا بیٹھا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان کی خدمت میں عرض کریں کہ ایمان کسے کہتے ہیں، اور خدا پر ایمان سے مفہوم کیا ہے، ہم خود ان سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ کمیونزم کی بنیاد مارکس کے اس نظریہ پر ہے کہ معاشی تغیرات ایک بندھے قانون کے مطابق رونما ہوتے رہتے ہیں جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوت ہے جس کی رو سے ایسا کچھ التزاماً ہوتا رہتا ہے۔ مارکس نے اس کا نام تاریخی وجوب رکھا ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں

ایمان

کہ کیا آپ تاریخی وجوب، یا اس کی قوت محرکہ یا نافذہ کا اسی قسم کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں جس قسم کا ثبوت آپ وجود باری تعالیٰ کے متعلق طلب فرماتے ہیں؟ آپ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گے۔ لیکن اس کے باوجود آپ اسے ایک حقیقت اور ابدی صداقت تسلیم کئے جائیں گے۔ آپ سوچئے کہ آپ تاریخی وجوب پر بلا ثبوت اور بلا دلیل ایمان رکھتے ہیں۔ اور اسے اندھی عقیدت سے تعبیر نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی اور ایمان کا نام لیتا ہے تو آپ یہ تحقیق کئے بغیر کہ اس سے اس کی مراد کیا ہے، اس پر اندھی عقیدت کا لیبل لگا کر اسے استہزاء کے سیلاب میں بہا دینا چاہتے ہیں۔ معاف کیجئے! اس قسم کا انداز ٹی یا کافی ہاؤس کے تو شایانِ شان قرار پا سکتا ہے۔ علم کی بارگاہ میں نہیں —— اب سنئے کہ العلم یعنی قرآن کریم کے لغت میں ایمان کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں ایمان رکھنے والوں کو مومن کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور مومنین کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ:-

إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا۔ (۲۵/۷۳)

"جب ان کے سامنے اور تو اور خود خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں تو یہ بہرے اور اندھے بن کر انہیں قبول نہیں کر لیتے"۔

فرمایئے! کیا ایسے ایمان کو "اندھی عقیدت" کہا جائے گا؟ اس ایمان (یعنی خدا پر ایمان کی طرف دعوت دینے والے نے پکار کر کہہ دیا تھا کہ أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (۱۲/۱۰۸)

میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہو گی۔ ان حضرات کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایک غیر مسلم مترجم (A.J. ARBERRY)

"علیٰ بصیرۃٍ" کا ترجمہ (WITH SURE KNOWLEDGE) کرتا ہے، اور ڈاکٹر سید عبداللطیف (مرحوم) ان الفاظ کا ترجمہ (FIRM CONVICTION) کرتے ہیں کیونکہ کیا اسے اندھی عقیدت کہا جائے گا؟ وہ اپنے مخالفین سے کہتا ہے کہ میں اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتا ہوں۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۲/۱۱۱) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تم بھی اس کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ ہمارے ہاں، بلا دلیل و برہان نہ کوئی بات منوائی جاتی ہے، نہ مانی جاتی۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے ایمان سے مفہوم — ایسا محکم یقین جو علم و بصیرت کا پیدا کردہ، اور دلائل و براہین کی رو سے پختہ ہو۔

اب آئیے ہستیٔ باری تعالیٰ پر ایمان کی طرف — ہمارے زمانے میں، سائنس (طبیعیات) کی دنیا میں جو مقام ایڈنگٹن (EDDINGTON) کو حاصل ہے، ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD) میں لکھتا ہے۔

> اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں۔ بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ (P. 44)

یعنی وجود باری تعالیٰ سے متعلق نظری بحثوں سے آگے بڑھ کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ جس راہ نمائی کے متعلق یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ہے، وہ کس قسم کی ہے، اور اس کی صداقت کا ثبوت کیا ہے۔ جس راہ نمائی کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ وحی پر مبنی ہے" وہ کیا ہے۔ اس کے متعلق ذرا آگے چل کر بات سامنے آئے گی۔ یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن اس کے مبنی بر صداقت ہونے کے لئے بھی نظری دلائل کافی نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اس کے نتائج سے پرکھ کر دیکھو۔ اگر اس کے نتائج، اس کے دعوے کے مطابق ہیں، تو یہ اس کی صداقت کا ثبوت ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اس کا دعویٰ باطل ہے۔ چنانچہ قرآن کریم رسول اللہ سے کہتا ہے کہ تم ان لوگوں سے کہو کہ میں نظری بحثوں میں الجھنا نہیں چاہتا۔ ایک نظام میں پیش کر رہا ہوں، اور اس کے برعکس دوسرا نظام تم پیش کرتے ہو۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ میرا پیش کردہ نظام کامیاب نہیں ہو سکتا، ہمارا نظام کامیاب ہو گا۔ تمہارے اور میرے دعاوی کے پرکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ :-

> اِعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۔ (۶/۱۳۶)

"تم اپنے پروگرام پر عمل کرو، مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے اور کون جھوٹا" لیکن اتنی بات میں ابھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو نظام ظلم و استبداد اور سلب و نہب (EXPLOITION) پر مبنی ہو گا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

یہ ہے وہ راہ نمائی، وہ اصول، جسے وحی نے پیش کیا ہے! سوال یہ ہے کہ اس راہ نمائی کے متعلق یہ کیوں تسلیم کیا جائے کہ یہ وحی پر مبنی ہے۔ یہ کیوں نہ مانا جائے کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہے! اس کا جواب بڑا آسان اور واضح ہے۔ فکرِ انسانی (یعنی موضوعِ پیشِ نظر کی نسبت سے) مارکس نے یہ اصول پیش کیا کہ دنیا میں ہر نظریہ اور ہر نظام تغیر پذیر ہے۔ آج ایک نظام وجود پذیر ہوتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ تک کارفرما رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ مٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے لیتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے ـــــ یعنی کچھ عرصہ سے نظامِ سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ وہ بہاری تماشا دکھا کر چلا جا رہا ہے، اور اس کی جگہ اس کی ضد، اشتراکیت کا نظام قیام پذیر ہو رہا ہے۔ جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ یہ نوعِ انسان کی ان مشکلات کو حل کر دے گا جن سے وہ اس وقت دوچار ہے۔ بہت اچھا ہم مانے لیتے ہیں کہ یہ ایسا ہی ثابت ہوگا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ جب یہ اپنے نتائج پیش کرے گا تو اس اصول کے مطابق جسے فکرِ انسانی نے پیش کیا ہے اس کے بھی بوریہ بستر باندھنے کا وقت آ جائے گا اور اس کی جگہ وہ نظام لے لے گا جو اس کی ضد ہوگا۔ اس کے برعکس، وحی یہ اصول پیش کرتا ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷) "جو نظام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہوگا، وہ ہمیشہ باقی رہے گا" اور یہ وہ اصول ہے جو بالکل تغیر پذیر نہیں۔ یہ ہمیشہ غیر متبدل رہے گا۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (۱۰/۶۴) "خدا کے بنائے ہوئے اصولوں میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔" ان اصولوں کو مستقل اقدار یا (PERMANENT VALUES) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

مبنی بر وحی

ہم اپنے ان دوستوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ دیانتداری سے بتائیں کہ ان کے نزدیک، وہ نظریہ یا فلسفۂ حیات بہتر اور قابلِ قبول ہوگا جس کی بنیادوں پر ایسا نظام قائم ہو سکے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو، یا ایسا نظریہ یا فلسفۂ حیات جس کی بنیادوں پر ایسا نظام قائم ہو جو کچھ وقت کے لئے انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو سکے، اس کے بعد اس نظام کے لئے جگہ خالی کر دے جو اس کی ضد ہو۔ یعنی جس میں پھر اسی سابقہ ظلم و استبداد اور سلب و نہب و استیصال کا دور دورہ شروع ہو جائے! سوچئے اور پھر دیانتداری سے کہئے کہ ان دونوں میں سے کونسا نظریہ یا فلسفۂ حیات نوعِ انسان کے حق میں بہتر ہوگا؟

بہرحال بات ہو رہی تھی قرآن کریم کی رُو سے ایمان کے مفہوم کی۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان کسے کہتے ہیں! ایسے اصولوں کی صداقت پر یقینِ محکم جو:-

(۱) علم و بصیرت پر مبنی ہوں اور دلائل و براہین ان کی تائید کریں۔

(۲) جو تمام بنی نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہوں۔

(۳) جن کے نتائج ان کی صداقت کا ثبوت پیش کریں۔

(۴) جو غیر متبدل ہوں۔ یعنی ان پر جب بھی عمل کیا جائے، وہ ویسے ہی نتائج برآمد کر سکیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان قلب و دماغ کی کامل رضامندی ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) دین میں جبر و اکراہ کا کوئی کام نہیں۔ جبر و اکراہ سے قلب و دماغ کی رضامندی حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

حیرت ہے کہ یہ حضرات علم و دانش کے اس قدر بلند آہنگ دعاوی کے باوجود (RATIONAL FAITH) اور (IRRATIONAL FAITH) میں تمیز و تفریق نہیں کر سکتے۔ مشہور سائیکالوجسٹ (ERICH FROMM) ان میں فرق کرتا ہوا کہتا ہے کہ:-

> (IRRATIONAL FAITH) یہ ہے کہ کسی بات کو محض اس لئے تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی اتھارٹی یا لوگوں کی اکثریت ایسا کہتی ہے۔ اس کے برعکس (RATIONAL FAITH) کی اصل و اساس ایک ایسے آزادانہ یقین (CONVICTION) پر ہوتی ہے جو انسان کے تخلیقی مشاہدہ یا فکر پر مبنی ہو۔ (MAN FOR HIMSELF; P. 205)

قرآن کریم (RATIONAL FAITH) کو ایمان کہہ کر پکارتا ہے اور (IRRATIONAL FAITH) کی سخت مخالفت کرتا ہے۔

اس کے بعد آپ آ جائیے اس مقام کی طرف جہاں مارکس اور اس کے ہم نواؤں نے کہا تھا کہ:-

> نوع انسان کی مشکلات کا حل ایسا نظام ہے، جس میں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق جان مار کر محنت کرے اور اس کے ماحصل سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے۔ لیکن ہمیں وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) نہیں ملتا جس کی رو سے لوگ ایسا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ یہ جذبۂ محرکہ دل و دماغ کی کامل رضامندی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیئے۔ شاید نوع انسان مزید مراحل طے کرنے کے بعد اس مقام تک پہنچ جائے —— اس دوران میں ہمیں بہ سبیل تنزل، سوشلزم کا نظام رائج کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جسے تشدد اور قوت کی رو سے قائم کیا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم نے کہا کہ اس کے لئے نوع انسان کو کسی مزید مرحلہ کے طے کرنے کی ضرورت نہیں —— یہ جذبۂ محرکہ، دل و دماغ کی یہ کامل رضامندی، مستقل اقدار خداوندی پر ایمان سے حاصل ہو سکتی ہے، جسے یہ حضرات اپنی غلط نگہی، تحقیق کی کمی، جذبات کی شدت اور جلد بازی کی وجہ سے مسترد کر چکے ہیں۔ انہوں نے خود ہی کمرے کے اندر سے کنڈی لگا رکھی ہے اور پھر چیخ رہے ہیں کہ ہمیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ نوع انسان کی مشکلات کا حل اس نظام میں ہے

جس ہیں :-

(۱) تمام افراد کے رزق۔ ضروریاتِ زندگی۔ مہیا کرنے کی ذمہ داری اس نظام کے سر ہو جو اقتدارِ خداوندی کے مطابق قائم ہو۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

(۲) یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ بنیادی سرچشمہ رزق، ارض پر کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہو، بلکہ یہ اس نظام کی تحویل میں رہے۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۲/۴۹)

(۳) اس میں ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق محنت کرے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)

(۴) اس محنت کے ماحصل میں سے صرف اپنی ضروریات کے لئے لے، باقی سب اپنے دل و دماغ کی کامل رضامندی سے دوسرے ضرورت مندوں کے لئے چھوڑ دے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲/۲۱۹)

(۵) بلکہ عند الضرورت، جن کی ضرورت زیادہ ہو، انہیں اپنے آپ پر بھی ترجیح دے۔ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔ (۵۹/۹)

(۶) اور یہ سب کچھ اس لئے کرے کہ یہ اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس کے لئے وہ نہ کسی سے ستائش کا متمنی ہو، نہ صلہ کا امیدوار۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۔ (۷۶/۹)

(۷) اور ایسا عمر بھر کرتا چلا جائے۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ (۳/۱۰۲)

ہم پوچھتے ہیں ان حضرات سے کہ اس ایمان میں کونسی بات قابلِ اعتراض ہے اور کونسی شق اندھی عقیدت پر مبنی ۔ ۔ ۔ ؟

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ایمان کی وہ کونسی بنیادی شق ہے جس پر قرآن کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے؟ جس قدر یہ سوال اہم ہے، اسی قدر قرآن کی رُو سے اس کا جواب آسان ـــــ معاشی نظام کوئی بھی ہو، اس کے دو اہم ستون ہوتے ہیں۔ ایک وسائلِ پیداوار اور دوسرے سامانِ زیست پیدا کرنے کی انسانی صلاحیتیں۔ انہی دو ستونوں کے صحیح ہونے کی صورت میں وہ نظام صحیح ہو سکتا ہے، اور انہی کے غلط ہونے سے غلط ـــــ اب دیکھئے کہ اس کے لئے، قرآن کریم وہ کونسا محور تجویز کرتا ہے جس کے گرد، اس نظام کی ساری مشینری گردش کرتی ہے۔ وہ محور ان چار لفظوں پر ایمان ہے کہ :-

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۔ (۱۶/۵۳)

کس بات پر ایمان ؟ آسان ترین زبان میں ان چار لفظوں کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کے وسائلِ رزق ہوں یا انسانی صلاحیتیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی میری اپنی نہیں۔ یہ سب خدا کی عطا فرمودہ ہیں۔ یہ میرا ایمان ہے اور اسی کے مطابق عمل پیرا ہونا، میرا نصب العین حیات۔ یعنی یہ ایمان کہ ؎

عشق میں ایک تم ہمارے ہو باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

آیئے! بارگہِ قرآنی سے اس اجمال کی تفصیل طلب اور تلاش کریں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ دنیا میں کوئی نعمت ایسی نہیں جو تمہیں خدا کی طرف سے نہ ملی ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نعمت میں کیا کچھ شامل ہے۔

اس لفظ (نعمت) کے لغوی معنی ہیں ہر وہ شے جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہو۔ مال و دولت، آسودگی اور خوشحالی۔ زندگی کی ہر آسائش۔ نیز سرفرازی اور سربلندی۔ ان تمام مفاہیم کے لئے یہ لفظ آتا ہے۔ اس کے ان معانی پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ زندگی کی کونسی خوشگواری اور سربلندی ہے جو اس میں شامل نہیں ہو جاتی اور ایک مومن یہ کہتا ہے کہ ان میں سے جو کچھ بھی مجھے حاصل اور میسر ہے، نہ وہ میری ملکیت ہے، نہ ہی میرے کسب و ہنر کا نتیجہ۔ یہ سب خدا کی ملکیت اور اُسی کا عطا کردہ ہے، تاکہ میں اسے اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صرف میں لاؤں۔ اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ جس چیز کو خدا اپنی کہتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور اسے اسی کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق صرف میں لانا چاہیئے۔ اور دوسرے یہ کہ جن امور کا پورا کرنا خدا اپنی ذمہ داری قرار دیتا ہے، عملاً وہ ذمہ داری اس نظام کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے متعین کردہ پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے وجود میں آئے۔ اس کو نظامِ خداوندی یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

لفظ نعمت کے اجمالی مفاہیم کو آپ نے دیکھ لیا۔ اب دیکھئے کہ قرآنِ کریم عملاً کون کون سی چیزوں کو اس میں شامل کرتا ہے۔ بغرضِ اختصار میں ان میں سے ایک ایک، دو دو، مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ان کی تفصیل میری تصانیف میں ملے گی۔

رزق خدا کی نعمت ہے

(۱) سب سے پہلے سامانِ زیست (رزق) کو لیجئے۔ اس میں وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جن پر زندگی کی بقا اور استحکام کا دارومدار ہے۔ اس کے متعلق سورۂ فاطر میں اجمالی طور پر کہا کہ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ..... يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ..... (۳۵/۳) "اے نوعِ انسان! تم اللہ کی ان نعمتوں کو ہر وقت سامنے رکھو جن سے اس نے تمہیں نوازا ہے۔ وہ تمہیں آسمانی فضا اور زمینی زرخیزی، دونوں کے ذریعے سامانِ زیست عطا کرتا ہے۔"

آپ دیکھئے کہ اس میں وہ تمام چیزیں آ گئیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔

سورۂ النحل میں ہے کہ خدا نے تمہارے فائدے کے لئے سمندر کو قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا تاکہ تم اس سے تروتازہ غذا حاصل کرو۔ نیز سامانِ زیبائش و آرائش۔ مثلاً موتی — پھر زمین کو دیکھو کہ

اس میں سے کیا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد کہا کہ یہ تو نعمائے خداوندی کی یونہی دو چار مثالیں ہیں۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ (۱۶/۱۸-۱۴) اگر تم ان کا شمار کرنا چاہو تو ان کا کبھی احاطہ نہ کر سکو۔ یہ اس قدر بے حد و حساب ہیں۔ (نیز ۳۵/۱۴)

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر کشتیوں (جہازوں) کا ذکر کیا ہے کہ وہ اس قدر ثقیلی سامان زیست لادے ہوئے کس طرح سفینۂ بحر پہ لطوں کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ اس قسم کا فطری نظام قائم کر دینا تمہارے بس کی بات نہ تھی۔ یہ سب خدا کا قائم کردہ ہے اور تمہارے فائدے کے لئے ہے۔ (۳/۴۴ نز ۴۲/۳۳ نز ۳۱/۳۱)

یہ تو سمندر کی بات تھی۔ اس نے کہا کہ سطح ارض کی طرف آؤ اور دیکھو کہ اس نے کس طرح مختلف مویشیوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم ان کا گوشت کھاتے، دودھ پیتے اور ان سے سواری کا کام بھی لیتے ہو۔ (۳۶/۴۴) ان کی کھالوں کے خیمے بناتے، اور ان کی اون سے اپنے لئے لباس اور دیگر ضروریات کی چیزیں بناتے ہو۔ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ (۴۳/۱۳) "انہیں تم نے تو نہیں بنایا۔ یہ سب تمہارے لئے نشوونما دینے والے کی طرف سے بطور نعمت عطا ہوئی ہیں۔

بعض مقامات پر ان تفاصیل کو اس قسم کے مختصر الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا کہ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ...... (۳۱/۲۰-۲۱) "کیا تم اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے اس سب کو خدا نے تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے۔ اور اس طرح کھلی اور چھپی ہوئی نعمتوں کو عام کر دیا ہے" اس کے بعد کہا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۳۱/۲) لیکن اس کے باوجود تم دیکھو گے کہ بعض لوگ خدا کے متعلق یونہی کج بحثی کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس نہ صحیح علم ہوتا ہے نہ سچی راہنمائی۔ نہ کوئی واضح ضابطۂ ہدایت۔ بس یونہی جھگڑتے رہتے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں، وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کے بعد کہا جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۴۵/۱۳) ارض و سما میں جو کچھ ہے اسے تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں، اصل حقیقت تک پہنچنے کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں ....

.... سوال یہ ہے کہ وہ حقیقت کیا ہے جو ان آیات خداوندی میں بیان کی گئی ہے اور تفکر و تدبر کے بعد نکھر کر سامنے آ سکتی ہے۔ وہ حقیقت ان دو مختصر لیکن جامع الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ ایک تو مِنْهُ اور دوسرے لَكُمْ۔ مِنْهُ کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام وسائل پیداوار، نہ تمہارے پیدا کردہ ہیں، نہ زرخرید ——— یہ خدا کے پیدا کردہ ہیں، اور اس کی طرف سے تمہیں، بلا مزد و معاوضہ۔ بطور نعمت عطا ہوئے ہیں۔ یعنی وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ

فَمِنَ اللّٰهِ - (۱۶/۵۳) ہر نعمت خدا کی عطا کردہ ہے۔ تمہاری ملکیت نہیں۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ ان تمام آیات میں لفظ لَکُمْ یا لَهُمْ آیا ہے۔ یعنی یہ نعمائے خداوندی، یہ سامانِ زیست جو بلا مزد و معاوضہ عطا ہوا ہے، کسی ایک فرد، ایک خاندان، ایک قبیلہ ایک قوم یا ایک طبقہ کے لئے نہیں تمام انسانوں کے لئے ہے۔ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) ہے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں سامانِ زیست مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ - (۵۶/۷۳) ہر بھوکے کے لئے خوراک کا سامان۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا - (۱۷/۲۰) جو وسائلِ رزق خدا کی طرف سے نوعِ انسان کو عطیۃً ملے ہوں، کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ ان کے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دے اور کہہ دے کہ یہ میری ملکیت ہیں۔ ان میں کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

سورۃ النحل میں اس حقیقت کو اور بھی واضح انداز میں بیان کر دیا۔ پہلے ان مختلف چیزوں کا ذکر کیا جو انسانی زندگی کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں، اور صفحۂ ارض پر بکھری پڑی ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ - (۱۶/۸۱) اس طرح اس نے تمہیں اپنی تمام نعمتیں عطا کر دیں۔ اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم قوانینِ فطرت کے مطابق انہیں حاصل کرو، اور اقدارِ خداوندی کے مطابق انہیں نوعِ انسان کی منفعتِ کلی کے لئے استعمال کرو۔ اسے کہیں گے احکامِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔ اللہ پر ایمان لانا۔ اسلام قبول کرنا۔ اس کے بعد رسول اللہ سے کہا کہ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ - (۱۶/۸۲) اگر اس کے بعد بھی یہ لوگ اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے کہ یہ سامانِ زیست تمام انسانوں کے مشترکہ مفاد کے لئے، اعراض برتیں، اس سے گریز کی راہیں نکالیں، اس سے سرکشی اختیار کریں، تو تم نے ان تک صحیح بات پہنچا دی، اور نہایت واضح طور پر پہنچا دی۔ اگر یہ اُسے تسلیم نہیں کرتے تو اس کا نتیجہ خود بھگتیں گے۔ اور اس کے بعد کہا کہ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ - (۱۶/۸۳) بات یہ ہے کہ یہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں۔ اسے اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں کہ یہ تمام وسائلِ پیداوار خدا کی طرف سے بطور نعمت ملے ہیں۔ یہ مفت ملے ہیں۔ بلا مزد و معاوضہ ملے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عملاً اس سے انکار کرتے ہیں اور ان پر اس طرح قابض ہو جاتے ہیں گویا یہ ان کے زرخرید ہیں۔ یہ کفرانِ نعمت درحقیقت خدا کا انکار ہے یہ اسلام نہیں کفر ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے ان عزیزوں سے جو خدا اور ایمان کے الفاظ سن کر شکن بر جبیں، کف بر دہان اور نعل بر آتش ہو جاتے ہیں کہ خدا کے اس تصور، اور اس پر اس ایمان میں انہیں کونسی بات قابلِ اعتراض نظر آتی ہے —— اور اس کے بعد وہ سوچیں کہ جب ایمان نام ہو کسی صداقت کے برضا و رغبت، بطیبِ خاطر، قبول اور اختیار کرنے کا، تو مارکس اور لینن نے جو کہا تھا کہ ان کے تصور کا معاشی نظام صرف ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہو سکے گا جو اس کے لئے برضا و رغبت

آمادہ ہوں، تو کیا قرآنِ کریم کی اس حقیقت پر ایمان رکھنے والے ہی وہ لوگ نہیں ہوں گے جو اسے قائم کر سکیں۔ انہوں نے ہی پہلے اسے قائم کیا تھا اور انہی کے ہاتھوں یہ پھر قائم ہو سکے گا۔

(۲) ابھی تک بات اتنی ہی ہو رہی تھی کہ سامانِ رزق کا بافراط ملنا، خدا کی نعمت ہے اور اس حقیقت کا تسلیم کرنا کہ یہ سب سامان تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے بطورِ عطیہ ملا ہے، خدا پر ایمان ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھیئے اور نعمت کا ایک اور گوشہ سامنے لائیے۔ سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے

اقوامِ عالم پر فضیلت

کہا گیا ہے۔ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ۔ (۲/۴۷) تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو، جب اس نے تمہیں اس سے نوازا تھا۔ یعنی تمہیں تمہاری ہمعصر اقوام پر افضلیت (SUPREMACY) عطا کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم کو، اس کی ہمعصر اقوام میں، ممتاز حیثیت حاصل ہونا بھی خدا کی نعمت ہے۔ بنی اسرائیل کو یہ نعمت اس وقت حاصل ہوئی تھی جب اس نے اپنی اجتماعی زندگی کو اقدارِ خداوندی کے قالب میں ڈھالا تھا، اور اس طرح وہ قوم شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی کی وارث قرار پا گئی تھی۔ یہی وہ نعمت تھی جس کے پیشِ نظر حضرت سلیمانؑ نے کہا تھا کہ رَبِّ اَوۡزِعۡنِیۡۤ اَنۡ اَشۡکُرَ نِعۡمَتَکَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ۔ (۲۷/۱۹) اے میرے نشوونما دینے والے! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں، جس سے تو نے مجھے اور میرے آباؤ اجداد کو نوازا ہے۔ وہ شکرِ نعمت اس طرح ادا ہوگا۔ وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰىهُ وَاَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِکَ فِیۡ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیۡنَ۔ (۲۷/۱۹) میں ایسے کام کروں جو عالمگیر انسانیت کو سنوارنے والے ہوں اور چونکہ ایسا کچھ صرف اجتماعی نظام کی رو سے ممکن ہوگا، اس لئے مجھے ایسی جماعت کا فرد بنا دے جو تیرے پروگرام کے مطابق اس فریضہ کو سرانجام دے۔

اس سے ظاہر ہے کہ آسائش و کشائشِ رزق ہی نہیں بلکہ اقوامِ عالم پر فضیلت بھی خدا کی نعمت ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ایسا نظام قائم کیا جائے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ جب جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (۳/۱۳۹) تو اس سے یہی مراد تھی کہ جب تک تم مومن رہو گے، تم پر دنیا کی کوئی قوم غالب نہیں آ سکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم اس نظام کو قائم کر دے جس میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہو نہ محکوم تو یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا۔ (۱۱۰/۲) لوگ فوج در فوج اس میں داخل ہوتے چلے جائیں گے اور اس طرح اس قوم کو ایسی قوت اور فضیلت حاصل ہو جائے گی کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی۔ اگر کوئی قوم ان کے مقابل آئے گی تو خاسر و نامراد رہے گی اور یہ قوم فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضۡلٍ لَّمۡ یَمۡسَسۡهُمۡ سُوۡٓءٌ (۳/۱۷۴) نعمائے خداوندی سے جھولیاں بھر بھر کر لائے گی اور کسی قسم کا شر انہیں چھو تک نہیں سکے گا۔ یہ اس لئے کہ وَاتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِیۡمٍ۔ (۳/۱۷۴) ان لوگوں کی زندگی اقدارِ خداوندی

سے ہم آہنگ ہوگی ـــ اور جو قوم اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو، اس پر فضیلتوں اور نعمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ وَاَوْرَثْنَا الْاَرْضَ ـ وہی زمین کے وارث قرار پاتے ہیں تَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ۔ انہیں یہاں بھی جتنی زندگی عطا ہوتی ہے۔ جس میں انہیں ہر طرح کا اقتدار و اختیار حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی جتنی زندگی۔ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ۔ (۲۹/۷۴) تم دیکھو کہ خدا کے پروگرام کے مطابق کام کرنے والوں کی محنت کا اجر کس قدر نعمت بداماں ہوتا ہے؟

یہاں تک ہم نے وسائلِ رزق کے متعلق گفتگو کی ہے۔ لیکن فکرِ انسانی کی رو سے قائم کردہ معاشی نظام کی اصل دشواری اس سے آگے جاکر سامنے آتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مارکس نے کہا تھا کہ سوشلزم میں اتنا تو تم کر لوگے کہ قوت اور تشدد کے ذریعے، وسائلِ رزق، لوگوں کی ذاتی ملکیت اور قبضہ سے نکال کر اسے مملکت کی تحویل میں دے دو۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان وسائل سے رزق حاصل کرنے، یعنی اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں مختلف لوگوں میں مختلف ہوں گی۔ جن میں زیادہ رزق پیدا کرنے کی صلاحیت ہوگی، وہ زیادہ مانگیں گے، تو انہیں زیادہ دینا بھی پڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی امیر ہوگا کوئی غریب۔ لہٰذا طبقاتی تفاوت سوشلزم میں ختم نہیں ہو سکے گا۔ یہ تفریق بدستور باقی اور قائم رہے گی۔ اسی طرح جس طرح یہ کیپٹل ازم میں باقی اور قائم ہے۔

قارونی ذہنیت

حقیقت یہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہی صلاحیتوں کے اس فرق پر ہے قرآن کریم نے قارون کو نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جب اس سے کہا گیا کہ تم اتنا زیادہ سمیٹ کر کیوں رکھے جا رہے ہو، تو اس نے جواب میں کہا تھا کہ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔ (۲۸/۷۸) یہ میرے اپنے کسب و ہنر، میری اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ اس میں دخل انداز ہو؟ قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ یہ ذہنیت صرف قارون کی نہیں تھی۔ ہر انسان (جو وحی سے بے نیاز ہو جائے گا۔) یہی کہے گا۔ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۳۹/۴۹) فتنہ و فساد کی اصل جڑ یہی ذہنیت ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بات بڑی معقول ہے اور مبنی برحقیقت۔

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو سوشلزم اور نظامِ سرمایہ داری میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا، اس لئے کہ یہ ذہنیت جسے قرآن نے فتنہ کی جڑ قرار دیا ہے، دونوں کی بنیاد میں موجود رہتی ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں ابھی عرض کروں گا، سوشلزم نظامِ سرمایہ داری سے بھی بدتر قرار پا جاتا ہے۔ صلاحیتوں کے اختلاف کو دونوں تسلیم کرتے ہیں، اور دونوں کے ہاں یہ بھی مسلم ہے کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت (یعنی کارکردگی) کے مطابق اُجرت ملنی چاہیئے۔

اُجرتیں مقرر کرنے کا پیمانہ

لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس وہ پیمانہ کونسا ہے جس سے آپ یہ ناپ سکیں کہ فلاں

نوعیت کی صلاحیت، یا کام، کی یہ اُجرت ہونی چاہئیے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا اور کس طرح کیا جائے گا کہ (مثلاً) مزدور کی اُجرت یہ ہونی چاہئیے اور انجینئر کی یہ۔ نظامِ سرمایہ داری ہویا سوشلزم یہ فیصلہ بہرحال آجر (یعنی EMPLOYER) ہی کرے گا اِسے یہ ملنا چاہئیے اور اُسے وہ — جب کارخانہ کا مالک سیٹھ تھا تو اس کا فیصلہ وہ کرتا تھا۔ جب اس کارخانہ کو (NATIONALIZED) کرکے حکومت اپنی تحویل میں لے لے، تو اس کا فیصلہ برسرِ اقتدار طبقہ کرے گا۔ مستاجر (EMPLOYEE) کو دونوں شکلوں میں یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اپنی اُجرت آپ مقرر کرے۔ یہ جو آپ اس وقت محنت کشوں اور مالکوں میں اس قدر لڑائی جھگڑے دیکھ رہے ہیں، خواہ وہ مالک سیٹھ ہوں اور خواہ حکومت، تو ان کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مزدور اس معاوضہ سے زیادہ اپنا حق سمجھتا اور طلب کرتا ہے جسے مالک مقرر کرتا ہے۔ اور چونکہ اس حق کے ماپنے کا پیمانہ دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں ہوتا، اس لئے اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ سوشلسٹ نظام اس فساد کو تشدد کے ذریعے دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس میں بُری طرح ناکام رہتا ہے۔ تشدد کے ذریعے کوئی فساد مٹ نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فساد کچھ وقت کے لئے دب جاتا ہے۔ لیکن جب یہ فساد دبا دیا جاتا ہے تو اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ مزدور، جی لگا کر کام نہیں کرتا، اور یہ وہ چیز ہے جسے آپ کسی سے زبردستی کرا ہی نہیں سکتے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ لیکن میں نے کہا ہے کہ سوشلزم کا نظام، نظامِ سرمایہ داری سے بھی بدتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب مختلف کارخانے (محنت گاہیں) مختلف مالکوں کے ہوں تو مزدور کو کم از کم یہ ذہنی اطمینان ضرور حاصل رہتا ہے کہ اس کارخانہ میں حسبِ پسند کام اور اُجرت نہ ملے گی تو میں کسی دوسری جگہ کام تلاش کر لوں گا۔ لیکن سوشلزم میں، چونکہ تمام محنت گاہوں کا مالک ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی حکومت، اس لئے مزدور سے یہ ذہنی اطمینان بھی چھن جاتا ہے، اور وہ اپنے آپ کو بےبس قیدی سمجھنے لگ جاتا ہے — غلامی اور آزادی میں یہی بنیادی فرق ہے۔ کام غلام بھی کرتا ہے اور اپنے کھیت میں ہل چلانے والا کاشتکار بھی، لیکن دونوں کی قلبی کیفیت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ غلام کی ہر وقت یہ تمنا اور کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وہ اس جہنم سے نجات حاصل کرلے۔ کاشتکار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اگر زیادہ وقت ملے تو وہ اور بھی جان مار کر محنت کرے۔ قرآنِ کریم نے اس نفسیاتِ غلامی کو بڑے بلیغ انداز میں واضح کیا ہے۔ حضرت موسےٰؑ نے فرعون سے کہا کہ میں تمہارے پاس یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ تم بنی اسرائیل کو اپنی غلامی کی زنجیروں سے رہا کر دو۔ فرعون نے حضرت موسےٰؑ کو جواب میں کہا کہ ہم نے تم پر اور تمہاری قوم پر یہ احسان کئے اور وہ احسان کئے۔ اور تم ان احسانات کا بدلہ اس طرح دینے کے لئے آئے ہو کہ اس قوم کو میرے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دو! ... اس کے جواب میں حضرت موسےٰؑ نے جو کچھ کہا وہ غلامی اور آزادی کے فرق کو نمایاں طور پر سامنے لے آتا ہے۔ آپ نے کہا کہ وَ تِلْکَ

نِعْمَةً تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ۔ (۲۶/۲۲) تم جو اپنی نعمتیں گنا رہے ہو تو کیا اُن کا بدلہ یہ ہے کہ تم نے قوم بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے؟ اس سے واضح ہے کہ کام کرنے والا جب بھی اپنے آپ کو کام کرنے پر مجبور سمجھے، وہ کبھی جی لگا کر کام نہیں کر سکتا۔ محنت کش جب اپنے آپ کو مجبور سمجھے گا تو اسے کچھ بھی اُجرت دیجئے، نہ وہ اس پر مطمئن ہوگا، نہ جان مار کر کام کرے گا۔ اگر محنت کش نظامِ سرمایہ داری میں اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا تو سوشلزم میں مجبور تر سمجھتا ہے۔ اور یہی چیز اس نظام کی ناکامی کی بنیادی وجہ ہے۔ محنت کش سے یہ کہنا کہ جو کچھ ہم تمہیں دیتے ہیں، تمہیں اس پر کام کرنا ہوگا۔ طوعاً نہ کروگے تو تم سے کرنا، کام کرایا جائے گا، اور تم اسے چھوڑ کر کہیں اور جا بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ رزق کے تمام دروازوں پر ہمارا ہی کنٹرول ہے۔ یہ ایک ایسا جہنم ہے جس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔

آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم اس مشکل ترین مسئلہ کا حل کیا بتاتا ہے! وہی حل جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ یعنی اس حقیقت پر ایمان کہ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳) ہر نعمت خدا کی عطا کردہ ہے۔ میری اپنی نہیں — ہم نے پہلے، ان نعمائے خداوندی میں وسائل پیداوار کا ذکر کیا ہے۔ اب دیکھئے کہ وہ انسانی صلاحیتوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔

انسانی صلاحیتیں بھی منجانب اللہ

قرآنِ کریم نے جس طرح وسائل پیداوار میں ارض (زمین) کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ (اور اس کی حیثیت ہے بھی ایسی) اسی طرح اس نے انسانی صلاحیتوں میں سمع (سماعت) و بصر (بصارت) اور قلب یا فؤاد (قوتِ فیصلہ) کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ یہ ذرائع (حواسِ خمسہ) معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور پھر قلب یا فؤاد، ان سے کسی نتیجہ یا فیصلہ تک پہنچتا ہے۔ ان ذرائع معلومات کے متعلق قرآن کریم نے متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ نہ یہ تمہاری پیدا کردہ ہیں، نہ ہی زرخرید، یہ خدا کی طرف سے عطا کی گئی ہیں۔ وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا۔ تم پیدا ہوئے ہو تو بالکل کورے۔ علم سے لا بلد۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ۔ (۱۶/۷۸) خدا نے تمہیں ذرائع معلومات اور قوتِ فیصلہ عطا کی ہے۔ اور انہیں اس نے 'نعمت اللہ' کہہ کر پکارا ہے۔ (۱۶/۸۳) اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خدا ہی نے تمہیں قوتِ گویائی عطا کی — عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵/۴) یعنی زبان کے ذریعے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا طریق، نیز تحریر کی صلاحیت۔ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ (۹۶/۴) اور اس طرح انسان اس قابل ہو گیا کہ جن امور کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا، ان کا علم حاصل کر سکے۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ (۹۶/۵) اس نے صحیح الدماغ ہونے کو بھی خدا کی نعمت قرار دیا ہے۔ جب رسول اللہ کو مخاطب کر کے (مخالفین کے اعتراض کے جواب میں) کہا کہ وَمَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ۔ (۶۸/۲) یہ خدا کی نعمت ہے کہ تو پاگل نہیں صحیح الدماغ ہے — ایک جگہ اس نے وسائل پیداوار (ذرائع رزق) اور انسانی صلاحیتوں کے بنیادی

ذرائع کا یکجا ذکر کیا ہے، جب کہا کہ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۔ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ۔ (۱۰/۳۱) ان سے پوچھو کہ کون ہے جو زمین اور آسمان سے سامانِ رزق عطا کرتا ہے اور تمہارے ذرائع معلومات پر جس کا بنیادی کنٹرول ہے! — اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ تسلیم کریں گے کہ خدا ہی ایسا کرتا ہے۔ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۔ (۱۰/۳۱) یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانہ کے مخالفین اس حد تک خدا کو ضرور مانتے تھے، اس لئے ان کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا، لیکن آج کے منکرینِ خدا کی طرف سے یہ جواب نہیں ملے گا۔ لیکن قرآن اس سے بحث نہیں کرتا کہ ان کی طرف سے کیا جواب ملے گا، اور اس جواب کی حیثیت کیا ہوگی؟ ان مباحث کی رو سے وہ انسان کو جس نقطہ تک پہنچانا چاہتا ہے، اس تک ہر جواب پہنچا دے گا اور وہ نقطہ یہ ہے کہ وسائلِ پیداوار اور انسانی صلاحیتوں کے ذرائع، بہرحال انسان کے اپنے پیدا کردہ نہیں، اس لئے وہ انہیں اپنی ذاتی ملکیت قرار نہیں دے سکتا۔ اس حقیقت کو (کہ یہ انسان کے پیدا کردہ نہیں) خدا پرست اور منکرِ خدا دونوں تسلیم کریں گے۔ معاشرہ ان صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے سامان اور ذرائع بہم پہنچاتا ہے اور فرد اپنی محنت سے ان میں جلا پیدا کرتا ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم رہتی ہے کہ بنیادی طور پر یہ انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتیں۔ اور یہیں سے قرآن آگے بات چلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشرہ میں مختلف نوعیتوں کے کام ہوتے ہیں جن کے لئے مختلف قسم کی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ کسی کے لئے ذہنی صلاحیت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کے لئے جسمانی قوت کی۔ اس حد تک صلاحیتوں میں تفاوت، انسان کی مدنی ضروریات کا تقاضا ہے۔ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۔ (۴۳/۳۲) اختلافِ مدارج سے مقصد یہ ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کی زیرِ ہدایات اور زیرِ نگرانی کام کر سکیں۔ لیکن (وہ کہتا ہے کہ) صلاحیتوں کے تفاوت کو اگر اس بات کے لئے وجہِ جواز قرار دیا اور بطور سند پیش کیا جائے کہ میں اپنی بہتر صلاحیتوں کی وجہ سے جو زیادہ دولت کماتا ہوں، وہ میری ذاتی ملکیت ہے جس میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا، تو یہ وہی قارونی (سرمایہ دارانہ) ذہنیت ہے، جو باطل ہے۔ دیکھئے! قرآن کریم نے اس حقیقت کو کیسے دلنشیں انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ اکتسابِ رزق کے معاملہ میں بعض لوگوں کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اور بہتر صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ۔ جن لوگوں کو زیادہ

صلاحیتوں میں اختلاف

صلاحیت حاصل ہوتی ہے وہ اس صلاحیت کے ماحصل کو اپنی ملکیت قرار دے لیتے ہیں اور اسے انہیں نہیں دیتے جو ان کی ماتحتی میں کام کر رہے ہوں۔ جب ان سے کہا جائے کہ تم ایسا کیوں نہیں کرتے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۔ واہ! اس سے تو گھوڑا، گدھا سب برابر ہو جائیں گے۔ میری کمائی میرے لئے، ان کی کمائی ان کے لئے۔ میں اپنی کمائی انہیں کیوں دے دوں؟ اس کے جواب میں قرآن

صرف دو لفظ کہتا ہے، وہ یہ کہ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ (۱۶/۷۱) ان کی اس ذہنیت کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ ان کی صلاحیتیں ان کی اپنی پیدا کردہ ہیں۔ خدا کی نعمت نہیں ہیں جو انہیں بلا مزد و معاوضہ عطا ہوئی تھیں۔ اس کے بعد قرآن کریم ان کے اس مفروضہ اور اس پر مبنی ذہنیت کی تردید، نہایت سادہ اور دلنشیں انداز سے روزمرہ کے واقعات کی رو سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک اصول یہ ہے — اور یہ اصول بڑا معقول اور غیر متبدل ہے کہ جو جتنا کمائے اسے اتنا ہی ملنا چاہئے۔ دوسرے کی کمائی میں اس کا کوئی حق نہیں ہونا چاہئے۔ تو تم بتاؤ کہ تم اپنے گھر میں اس اصول پر کاربند کیوں نہیں رہتے۔ جو بچہ تمہارے ہاں پیدا ہوتا ہے اس میں کچھ بھی کمانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بھی یہ بچے ایک عرصہ تک کچھ بھی کما کر نہیں لاتے۔ لیکن اس کے باوجود، تم اپنی کمائی کا بیشتر حصہ ان پر خرچ کر دیتے ہو۔ بلکہ ان کی ضروریات اور تقاضے پہلے پورے کرتے ہو۔ تمہارا اصول اگر ایسا ہی محکم اور بے لچک ہے تو تم یہاں اس پر قائم کیوں نہیں رہتے؟ یہاں تم اس اصول پر عمل کرتے ہو کہ جو شخص کمانے کے قابل ہے وہ پوری پوری محنت سے کمائی کرے، اور اس کی کمائی سے ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے۔ تم میں اور ہم میں فرق یہ ہے کہ تم صرف اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے ہو، اور ہم ساری دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ تم صرف اپنے بال بچوں کو اپنا سمجھتے ہو اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا — اس لئے کہ جس خدا پر ہمارا ایمان ہے، وہ کسی خاص خاندان کا خدا نہیں، وہ رب العالمین ہے — اور، یہ پہلا سبق ہے کتابِ ہدیٰ کا — اس کے بعد قرآن، اس قسم کی قارونی ذہنیت رکھنے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ (۱۶/۷۲) یہ لوگ باطل پر ایمان رکھتے ہیں، اور خدا کی نعمتوں سے کفر برتتے ہیں — یہ ہے قرآنِ مجید کی رو سے کفر اور ایمان کا عملی مفہوم — میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے کمیونسٹ عزیزوں سے کہ وہ بتائیں کہ اس ایمان پر انہیں کیا اعتراض ہے؟ کیا یہ وہی ایمان نہیں جس کے فقدان کی وجہ سے مارکس یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ حل تو وہی ہے جسے میں اصولی طور پر پیش کر چکا ہوں لیکن مجھے وہ جذبۂ محرکہ نہیں ملتا جو اس حل کو ممکن العمل بنا دے۔ قرآن وہ حل بھی پیش کرتا ہے اور اسے ممکن العمل بنانے کا طریق بھی بتاتا ہے۔

کفرانِ نعمت ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآن کریم، کفرانِ نعمت کو قارونی (سرمایہ دارانہ) ذہنیت قرار دیتا اور اسے ایمان کی ضد بتاتا ہے۔ (۱۶/۷۱ : ۲۹/۶۷) وہ کہتا ہے کہ یہی وہ کفر ہے جو قوموں کو تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گراتا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ۔ (۱۴/۲۸) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے کفرانِ نعمت کیا، اور اس طرح اپنی قوم کے کارواں کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کا سدا کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ اس

لئے ان کا سارا سامانِ تجارت تباہ ہو گیا ــــــ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۔ وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴/۲۹) یعنی ان لیڈروں نے اپنی قوم کو جہنم میں دھکیل دیا۔ کیسی بُری تھی وہ منزل جس میں انہوں نے اُسے جا اتارا۔

کفرانِ نعمت کے مقابلہ میں، اس نے 'شکرِ نعمت' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کفرانِ نعمت کے معنی ہیں یہ عقیدہ ہے کہ وسائلِ پیداوار (ارض) پر انسان کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے اور رزق پیدا کرنے کی صلاحیتیں بھی اس کی اپنی ہیں اس لئے ان کی رُو سے حاصل کردہ دولت بھی صرف اس کی ملکیت ہے۔ اس کے برعکس 'شکرِ نعمت' کے معنی ہوں گے اس حقیقت پر ایمان کہ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (۱۶/۵۳) وسائلِ پیداوار ہوں یا خود میری صلاحیتیں یہ سب خدا کی عطا فرمودہ ہیں اور انہیں میری تحویل میں اس لئے دیا گیا ہے کہ ان سے حاصل کردہ رزق کو میں اسی کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق اپنے استعمال میں لاؤں اور تقسیم کروں۔ یہ سب اسی نظام کی رو سے ہوگا جو قوانینِ خداوندی کے مطابق ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہوگا جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس طرح حاصل کردہ رزق کو قرآن کریم نے رزق حلال و طیب قرار دیا ہے اور اس کو خدا کی عبادت (اطاعت)۔ سورۃ النحل کی اس آیۂ جلیلہ پر غور کیجئے اور پھر کانپ اٹھیے۔ اس میں کہا گیا ہے۔ فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ

رزق حلال

حَلَالًا طَيِّبًا ۔ خدا نے تمہیں جو رزق عطا فرمایا ہے، اسے حلال اور طیب طریق سے کھاؤ۔ وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (۱۶/۱۱۴) اگر تم اس کے مدعی ہو کہ تم خدا کے سوا کسی کی عبادت (اطاعت) نہیں کرتے (جیسا کہ تم اپنی ہر نماز میں اعتراف و اعلان کرتے ہو کہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ ۔ ہم صرف تیری عبادت (اطاعت) کرتے ہیں) تو اس طرح شکرِ نعمت کرو۔ اور اس کی وضاحت اس نے اس سے اگلی آیت میں کر دی، جس میں کہا کہ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ...... (۱۶/۱۱۵) "تم پر حرام قرار دیا گیا ہے، مردار۔ خون۔ لحم خنزیر۔ اور ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے" ــــ اس وقت عزیزانِ من! نہ اس کی فرصت ہے نہ گنجائش کہ میں اس عظیم اور اہم ترین موضوع کی وضاحت کروں۔ (اس کی وضاحت میں نے اپنی تفسیر میں کر دی ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا عرض کر دینے پر اکتفا کروں گا کہ قرآن کریم کی رُو سے ہر وہ شے حرام ہے جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب وسائلِ رزق کو غیر اللہ کی طرف منسوب ہی نہیں بلکہ انہیں ان کی ملکیت قرار دے دیا جائے، تو وہ رزق، رزقِ حلال کیسے قرار پا سکے گا؟ رزقِ حلال تو

رزق اللہ

وہی رزق ہے جسے خدا نے کہیں رزق اللہ کہا ہے۔ (۲/۶۰) کہیں رِزْقُ رَبِّكَ ــــ تیرے رب کا رزق (۲۰/۱۳۱) اسی کو وہ رِزْقًا حَسَنًا کہہ کر پکارتا ہے۔ (۱۱/۸۸) اور اس کی وضاحت یہ کہہ کر دیتا ہے۔ وَرَزَقَنِي مِنْهُ ۔ یہ وہ رزق ہے جو کسی انسان سے نہیں بلکہ

خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اسی کو وہ رِزْقٌ كَرِيمٌ (۲۲/۵) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی عزت کی روٹی۔ حقیقت یہ ہے کہ "عزت کی روٹی" ہوتی وہ ہے جس میں انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج، اور دست نگر نہ ہو۔ جونہی انسان روٹی کے لئے دوسرے انسانوں کا محتاج ہوا ـــــ خواہ یہ دوسرے انسان وہ ہوں جنہوں نے ذرائع رزق کو انفرادی طور پر اپنی ملکیت میں لے رکھا ہو، یا انسانوں کا کوئی گروہ جو ان ذرائع پر قابض ہو کر بیٹھ جائے ـــ تو وہ انسان شرف و مجد انسانیت سے محروم، اور ذلیل و خوار ہو گیا۔ یہی وہ غیر اللہ کے ہاتھوں سے ملنے والا رزق ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی!

انسان تو ایک طرف، جو حیوان اپنے رزق کے لئے انسانوں کا محتاج ہو جائے وہ اپنی جبلی خصوصیات کھو بیٹھتا ہے۔ جنگل کے شیر اور سرکس کے شیر کا فرق واضح ہے ـــ اور یہ بات صرف اس نظام میں ممکن ہے جو ان انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو جن کا ایمان یہ ہو کہ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (۱۶/۵۳) یہ وہ لوگ ہوں گے جو جان مار کر محنت کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ کمائیں گے۔ اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لیں گے اور بقایا دوسرے ضرورت مندوں کے لئے کھلا چھوڑ دیں گے۔ یہ "دوسرے لوگ" بھی اس رزق کو بطور خیرات یا احسان نہیں لیں گے بلکہ اپنا حق سمجھ کر طلب اور وصول کریں گے کہ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ۔ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۔ (۲۴-۲۵) "ان کے مال میں ضرورت مندوں کا ایسا حق ہے جس کا سب کو علم ہے"۔ اس نظام کی یہی وہ بنیاد ہے ـــ یعنی یہ ایمان کہ تمام نعمتیں خدا کی طرف سے ہیں۔ جس کے متعلق نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے جماعتِ مومنین کو تاکید کی گئی کہ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ (۹۳/۱۱) "اپنے نشو و نما دینے والے کی نعمتوں کا عام چرچا کرتے رہا کرو"۔

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انسان کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کس طرح ہوتی، اور قائم کیسے رہتی ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور قائم رہتی ہے۔ نظریۂ حیات سے متعلق تبدیلی سے ـــ منکرینِ خدا کی غلط نگہی یہی نہیں ہوتی کہ وہ خدا کی ہستی کے منکر ہوتے ہیں۔ ان کی حقیقی غلط نگہی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کو بس اسی دنیا کی زندگی قرار دیتے ہیں، جس کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس نظریۂ حیات کے بعد، انسان میں کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں پیدا ہوتا جو اسے اس پر آمادہ کر دے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس کے ماحصل میں سے زیادہ دوسروں کو دے دے۔ یہ جذبہ اس ایمان سے پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی صرف طبیعیاتی زندگی نہیں۔ وہ موت کے بعد بھی قائم رہتی اور

آگے چلتی ہے۔ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ اس میں ایک اور چیز بھی ہے، جسے اس کی ذات کہا جاتا ہے۔ اِس زندگی میں انسان کی تگ و دو کا مقصد صرف اپنے جسم کی نشوونما نہیں، اپنی ذات کی نشوونما بھی ہے۔ اس کے جسم کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ اپنے صرف میں لاتا ہے، لیکن اس کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے۔ جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ موت سے انسانی جسم تو باقی نہیں رہتا، لیکن اس کی ذات آگے جاتی ہے تاکہ وہ مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ یہ ایمان درحقیقت خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی صداقت کے یقین پر استوار ہوتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ میرا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے جو میرے سامنے آکر رہے گا — خواہ اس دنیا میں اور خواہ اس کے بعد۔

ایمان بالآخرت — اسے ایمان بالآخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ایمان کے بغیر نہ انسان کسی ایثار کے لئے برضا و رغبت تیار ہو سکتا ہے نہ کسی قربانی کے لئے بطیب خاطر آمادہ۔ اس عقیدہ سے انسان کے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰی۔ (۹۲/۱۸) جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے مَا + لَهٗ — وہ اسے دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓی (۹۲/۱۹) وہ اسے دوسروں کو اس لئے نہیں دیتا کہ اسے اس کے معاوضہ میں ان سے کچھ ملے گا۔ ان کے پاس ہوتا ہی کیا ہے، جسے وہ اس کے معاوضہ یا صلہ میں دے سکیں۔ نہ ہی ان پر اس کا کوئی احسان ہوتا ہے۔ جس کا بدلہ اتار لے کے لئے اُسے کچھ دیں۔ وہ دیتا ہے۔ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی۔ (۹۲/۲۰) وہ اسے صرف خدا کے متعین کردہ عالمگیر نظامِ ربوبیت کے قیام و استحکام کے لئے دیتا ہے۔ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی۔ (۹۲/۲۱) اس سے اس کی محنت اور کاوش صحیح نتائج سے ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی اس کا بہترین صلہ ہے جس سے اسے حقیقی مسرت حاصل ہے۔ یہ ہے وہ جماعت جس کے ہاتھوں وہ نظام متشکل ہوا، اور ہو سکتا ہے۔ جس کا خواب تو مارکس نے دیکھا، لیکن جس خواب کی تعبیر کو ممکن العمل بنانے کے لئے اُسے کوئی اساس نہ مل سکی۔ اس نظام میں تو جبر و اکراہ سے وسائل پیداوار ان لوگوں سے چھینے جاتے ہیں، اور نہ ہی قوت اور تشدد سے انہیں کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ، اپنا سب کچھ بطیب خاطر اس نظام کے حوالے کر دیتے ہیں اور اس کے بعد، وہ کام جو ان کے سپرد کئے جاتے ہیں، انہیں اپنے قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ جبر و اکراہ کا اس نظام میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد ہی لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ۔ (۲/۲۵۶) کے اصولِ محکم پر استوار ہوتی ہے۔ اس ایمان کی حامل جماعت کے سوا دنیا کی کوئی جماعت، کوئی ازم، یا کوئی نظام۔ نہ اسلامی کہلا سکتا ہے، خواہ

رزق کو زبردستی دوسروں سے چھین لے، اور ان کی کمائی پر قابض ہو جائے۔ یہ ملوکیت ہوگی جو استبداد کی بدترین شکل ہوگی، اور تشدد کے بل بوتے پر اسے قائم رکھا جا سکے گا۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے اقبالؒ نے سوشلزم کے نظام کو سامنے رکھ کر کہا تھا کہ ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ سوشلزم نے (جسے محنت کشوں کا نظام کہہ کر دھوکا دیا جاتا ہے) جہاں جہاں بھی قدم رکھا ہے، ملوکیت کے انہی قدیم حربوں سے کام لیا گیا ہے ـــ قرآن کی پیش کردہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کیجئے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ۔ (۱۳/۱۱) کسی قوم کے خارجی حالات میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک پہلے ان میں نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔ اسی نفسیاتی تبدیلی کا نام، قرآن کریم کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ سوشلزم قوم کے خارجی حالات (یعنی اس کی معاشی اور معاشرتی زندگی) میں نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، محض ڈنڈے کے زور پر تبدیلی پیدا کرنا چاہتی ہے جو ناممکن ہے۔ جسے وہ نفسیاتی تبدیلی کہہ کر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور دوسروں کو مبتلا رکھنا چاہتی ہے وہ تبدیلی نہیں، محض انسان کے اندر خلا پیدا کرتا ہے ـــ خدا سے بھی انکار، دین سے بھی انکار، آخرت سے بھی انکار۔ ہر صداقت سے انکار اور اقرار کسی بات کا بھی نہیں ـ نفسیاتی تبدیلی، کسی مثبت اقرار سے پیدا ہوتی ہے۔ جسے قرآن اِلَّا کہہ کر پکارتا ہے۔ محض انکار سے نہیں جسے وہ لَا سے تعبیر کرتا اور اِلَّا تک پہنچنے کے لئے منزل اول قرار دیتا ہے۔ مارکس کی ناکامی کی یہ بنیادی وجہ تھی۔ اس کے فلسفہ میں لَا ہی لَا تھا۔ اِلَّا کہیں نہیں تھا۔

اور اس کے بعد اس حقیقت کو بھی یاد رکھئے کہ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ۔ (۸/۵۳) کسی قوم کو اس کی داخلی تبدیلی (ایمان) کی بنا پر جو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ اس وقت تک باقی رہتی ہیں جب تک ان میں وہ تبدیلی باقی رہتی ہے۔ جب، وہ تبدیلی باقی نہیں رہتی، اس کی رو سے حاصل شدہ نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ یہ جواب ہے اس اعتراض کا جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ اسلام اگر صداقت پر مبنی نظام تھا تو وہ مسلسل قائم کیوں نہ رہا۔ اسلام درحقیقت وہ ذریعہ ہے جس سے قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ اس ذریعہ سے ایک قوم نے اپنے اندر تبدیلی پیدا کی تو اسے وہ نعمتیں حاصل ہو گئیں۔ جب تک وہ تبدیلی پیدا ہوتی رہی، وہ نعمتیں میسر آتی رہیں۔ جب اس نے اس تبدیلی کو پیدا کرنا چھوڑ دیا، وہ نعمتیں اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ اب اگر یہ قوم چاہتی ہے کہ وہ نعمتیں اسے پھر سے حاصل ہو جائیں تو اسے

[illegible]

اس کے ذریعے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا چاہے، وہ تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ لا تبدیل لکلمات اللہ کے یہی معنی ہیں۔

لیکن مسلمان بھی ہر خدا فراموش قوم کی طرح چاہتا ہے کہ اس تبدیلی کو اپنے اندر پیدا کئے بغیر وہ نعمتیں حاصل کر لے۔ اسی لئے وہ کبھی مغربی جمہوریت کی طرف لپکتا ہے، کبھی سوشلزم کی طرف دوڑتا۔ لیکن خدا کا قانون اٹل ہے کہ نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، خارجی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی قوم کو اس کے بغیر کسی وقت کچھ مل جاتا ہے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے ڈاکو کسی کی متاعِ حیات لوٹ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم خوشحال ہو گئے ہیں۔ ابدی صداقتوں پر ایمان کے بغیر، جو کچھ بھی کوئی حاصل کرے گا وہ ڈاکہ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھے گا، خواہ وہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے استعارہ کی زبان میں نہایت دلکش حکایاتی انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سکندرِ اعظم نے ایک بحری قزاق (ڈاکو) سے کہا کہ ؎

صلہ تیرا تری زنجیر یا شمشیر ہے میری
کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی

اس قزاق نے اُسے جواب دیا کہ ؎

سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟
ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی؛
کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی میں دریائی

لہٰذا مشرق و مغرب کے سرمایہ دار ہوں، یا کمیونزم اور سوشلزم کے علمبردار، قرآنِ کریم کی رو سے دونوں قزاق ہیں، کہ دونوں کا پیشہ سفاکی ہے۔

اس قزاق اور سکندر میں فرق یہ تھا کہ قزاق سے تو سکندر نے باز پرس کر لی، لیکن سکندر مطمئن اور مگن تھا کہ اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں، کیونکہ اسے اقتدارِ اعلیٰ (... SOVEREGNTY) حاصل ہے۔ لیکن جو نظام اقدارِ خداوندی کے مطابق قائم ہو گا، اس میں کوئی بھی اس باز پرس سے مامون اور مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ اس میں ہر ایک کا ایمان یہ ہو گا کہ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۔ (۱۰۲/۸) تم سے ان نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا کہ تم نے انہیں کیسے حاصل اور صرف کیا تھا۔ اس ایمان کے بغیر کوئی بھی قزاقی سے باز نہیں رہ سکتا۔

آخر میں، میں، عزیزانِ من! اس اعتراض کو بھی سامنے لے آنا چاہتا ہوں جو سرمایہ داروں کی طرف سے قرآن کے معاشی نظام کے خلاف عائد کیا جاتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں بار بار کہا گیا ہے کہ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۸۱) ہر

شخص کو اس کی پوری پوری کمائی ملے گی اور کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔

اعتراض اور اس کا جواب

سوال یہ ہے کہ جو شخص زیادہ کماتا ہے لیکن اسے آپ دیتے ہیں اس کی ضروریات کے مطابق، تو اسے اس کی پوری پوری کمائی تو نہیں ملتی۔ کیا یہ اس پر ظلم نہیں؟ قبل اس کے کہ اس اعتراض کا جواب دیا جائے ہم یہی بات اور ان کے ساتھ سوشلزم کے علمبرداروں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ محنت کش لوگوں کو ان کی پوری پوری کمائی کب دیتے ہیں؟ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے آپ کے پاس وہ کونسا پیمانہ ہے جس سے کسی مزدور کی اجرت ماپی جا سکے۔ آپ مزدور کو وہی دیتے ہیں جو اس سے طے پا جاتا ہے۔ اور محتاج اور ضرورت مند سے جس طرح معاملہ طے پاتا ہے اس کا کسے علم نہیں؟ باقی رہی سوشلزم، سو اس میں مزدور کے ساتھ معاملہ طے پانے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ صاحب اقتدار طبقہ جو فیصلہ بھی کر دے اسے انہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کیا اس کو پوری پوری اجرت دینا کہتے ہیں؟ قرآنی نظام میں ہر کارکن خود بطیب خاطر فیصلہ کرتا ہے کہ اسے یہاں تو اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔ باقی اگلی زندگی میں ادا کر دیا جائے۔ اس کی آرزو اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱) اس دنیا کی خوشگواریاں بھی اور آخرت کی خوشگواریاں بھی۔ وہاں کی خوشگواریوں کے متعلق مختصر ترین الفاظ میں بس یہ کہہ کر لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ (۵۰/۳۵) وہاں وہ جو چاہیں گے ملے گا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

اگر آخرت کے منکر وہاں کی خوشگواریوں کے وعدہ کو قابل اعتنا نہ بھی سمجھیں، تو قرآن کا نظام اس دنیا میں بھی اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ ہر ایک کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔ کیا یہ مارکسزم کے اس خواب کی تعبیر نہیں جسے وہ ناممکن الحصول سمجھتا تھا؟ فرمائیے — اس پر کیا اعتراض ہے؟

یہ ہے اس مشکل ترین مسئلہ کا وہ حل جو ام الکتاب کی طرف سے ملتا ہے۔ والسلام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

باب المراسلات

۱۔ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

کارِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

پہلے اِس فساد کا دائرہ مسجد یا اُس کے مضافات ہوتے تھے۔ پھر مختلف فرقوں کے مناظروں اور مباحثوں سے اس دائرہ میں مزید وسعت پیدا ہو گئی۔ "اسلام کے نام پر حاصل کی ہوئی مملکت" پاکستان میں اس نے ملک گیر حیثیت اختیار کر لی۔ اور اب اس کے جراثیم عالمگیر حیثیت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ قبل ازیں ہمارے ہاں کے مذہبی رہنما یا بعض جماعتوں کے نمائندے افریقہ، ملایا، انڈونیشیا وغیرہ "اسلامی" ممالک میں جاتے اور وہاں سے جھولیاں بھر بھر کر "فتوحات" لاتے۔ اس کاروبار کے نفعِ کثیر کو دیکھ کر انہوں نے اب انگلستان کو بھی اپنی جولانگاہ کے دائرہ میں لے لیا ہے۔ وہاں بعض علاقے (بریڈفورڈ یا برمنگھم وغیرہ) ایسے ہیں جہاں خصوصیت سے پاکستانیوں کی اکثریت ہے۔ چنانچہ یہ مذہبی پیشہ ور اُن علاقوں کو خاص طور پر اپنی نوازشات کا مہبط بناتے ہیں۔ اِس سے وہاں کیا ہونے لگا ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے ایک خط سے لگائیے جو ہمیں ایک ایسے سیدھے سادھے مسلمان کی طرف سے موصول ہوا ہے جس کا سینہ ملت کے درد سے لبریز ہے۔ آپ اس خط کو ملاحظہ فرمائیے اور ہماری طرح خون کے آنسو روئیے۔ وہ لکھتے ہیں :-

> علاوہ ازیں یہاں اس ملک میں باہر سے جو مسلمان آئے ہوئے ہیں، ۱۹۷۰ء تک فضا بڑی اچھی تھی۔ مگر ۱۹۷۰ء کے بعد یہاں پیروں اور تصوف کے حامیوں کی قطاریں لگ گئی ہیں۔ عام طور پر سارے لوگوں کو اسلام سے تصوف کی طرف لیا جا رہا ہے۔
>
> خاص کر ایک طبقہ ایسا بڑھ رہا ہے جو "جلیاں[1] مارنے" کے حامی اور حضرت محمدؐ کو حیات النبی، حاضر و ناظر جانتے ہوئے صلوٰۃ وغیرہ کرتے ہیں، اور کافی

---

[1] عرسوں پر "بھنگڑا ڈالنے والے"۔ (طلوعِ اسلام)

حد تک دنگہ فساد شروع ہو گیا ہے۔ حال ہی میں برمنگھم کی جامع مسجد میں کافی لڑائی ہوئی ہے۔ رمضان کے مہینہ سے مہینہ میں پیروں کا ٹولہ اور "جلیاں مارنے والے" ایک طرف تھے اور اہلِ حدیث یا دوسرے لفظوں میں، دیوبندی دوسری طرف۔ تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ انسان اس مسئلے پر سخت بے چین ہیں۔ سُنّی اور وہابی کا مسئلہ اس قدر زور پکڑ گیا ہے کہ اب گھروں کے شیشے توڑنا اور دستی بم ایک دوسرے کے گھروں پر پھینکے جاتے ہیں مجھ سے لندن شہر یا دوسرے شہروں سے جو ہمارے حامی ہیں مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ کچھ طلوعِ اسلام میں راہنمائی کریں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑا پرانا قصہ ہے مگر یہاں پر فضا بہت گندی ہو گئی ہے۔ خاص کر چھوٹے بچوں کا مستقبل بڑا خطرناک نظر آ رہا ہے۔ ہنگامہ آرائیاں روزمرہ کا معمول بن گئی ہیں۔ لندن میں جو جماعتِ اسلامی کا بہت بڑا اڈا اسلامک کلچر کے نام سے مشہور ہے پورے انگلینڈ میں ہر شہر میں ایجنٹ ان کے پھیلے ہوئے ہیں اور فتنہ بازی میں اس قدر ماہر ہیں کہ دوسرے لوگوں کو سُنّی اور وہابی کی تفرقہ بازی میں دو دو ہاتھ کر رہے ہیں، مگر عوام ہیں کہ شتر بے مہار کی طرح دوسروں کے اشاروں کے منتظر رہتے ہیں، اور اسلامی قدروں کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) حالیہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ برمنگھم کی جامع مسجد جو تقریباً چار لاکھ پونڈ کے قریب خرچہ سے بنائی جا رہی ہے، جس کا کچھ حصّہ تعمیر ہوا ہے۔ پیروں اور "جلیاں مارنے والوں" کی گدّی بنانے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔

اور یہاں مقامی مسلمانوں میں پڑھا لکھا طبقہ بہت کم ہے، جن کو صحیح اسلامی روح کا پتہ ہو۔ غیر مذہبوں کے اندر ہم لوگ ایک تماشہ بن کر رہ گئے ہیں۔ برائے مہربانی راہنمائی فرمائیں نوازش ہوگی۔

ظاہر ہے کہ ہم یہاں بیٹھے اِن فساد انگیزیوں کا کیا علاج کر سکتے ہیں؛ خطرہ یہی ہے کہ اس قسم کی خانہ جنگی کے پیشِ نظر حکومتِ انگلستان، وہاں بسنے والے تمام پاکستانیوں ہی کو ملک بدر نہ کر دے۔

ہم حکومتِ پاکستان سے گزارش کرنا چاہتے تھے کہ وہ پاکستان کے ہائی کمشنر متعینہ انگلستان کے نوٹس میں یہ صورتِ حالات لائے اور اس سے کہے کہ وہ اِن فساد انگیزیوں کی روک تھام کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرے۔ لیکن جو حکومت اِس فتنے کو فرو کرنے کے لئے یہاں کچھ نہیں کر سکی، وہ، وہاں اس کے ازالہ کے لئے کیا کر سکے گی!

۲۔ مسلمان لڑکیوں کی غیر مسلموں سے شادی

انگلستان ہی سے ایک اور دوست ایک ایسی مشکل کی طرف توجہ دلاتے ہیں، جو بقول اُن کے، آجکل وہاں بسنے والے مسلمانوں کے لئے وجہِ صد اضطراب بن رہی ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ملخصاً درج ذیل ہے:۔

> یہاں ایک مسئلہ کچھ عرصہ سے خاصی سماجی پریشانی کا باعث بن رہا ہے۔ اور اُردو اخبارات کے ذریعے اس پر اچھا خاصا اظہارِ خیال ہو رہا ہے۔ مگر حل کوئی بھی نہیں دے سکا۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اِس ملک (برطانیہ) میں نوجوان مسلم لڑکیوں کے لئے مسلم خاوندوں کا کال پڑا ہوا ہے۔ لڑکے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ وہ انگریز لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ انہیں اس کی مکمل آزادی ہے۔ مذہب بھی ان کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنتا لیکن لڑکیوں کو اِس کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی مسلمان لڑکی غیر مسلم سے شادی کر لیتی ہے، تو یہاں شور برپا ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ نے یہاں بحث و تمحیص کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ آپ طلوعِ اسلام میں اس پر قرآنی نقطۂ نظر سے اپنی رائے دے دیں تو یہاں کے والدین اور لڑکیوں کو شاید اس اُلجھن کے حل کرنے میں مدد مل جائے۔

طلوعِ اسلام برطانیہ میں رہنے والے مسلمان والدین کی اس پریشانی اور وہاں کی مسلمان لڑکیوں کی زندگی کی اس مشکل کا ہمیں پورا پورا احساس ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے ہم اس کا یہ حل نہیں پیش کر سکتے کہ مسلمان لڑکیوں کو بھی اجازت دے دی جائے کہ وہ غیر مسلموں سے شادی کر لیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے مسلمان مرد کو تو اس کی اجازت ہے کہ وہ اہلِ کتاب (مثلاً عیسائی) عورت سے شادی کر لے۔ لیکن مسلمان عورت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ غیر مسلم مرد سے (خواہ وہ اہلِ کتاب ہی کیوں نہ ہو) شادی کر سکے[ملہ]۔ یہ قرآنِ کریم کا فیصلہ ہے جس میں نہ کوئی تغیر و تبدل کر سکتا ہے نہ استثنا...... ہم نہیں سمجھ سکے کہ قرآنِ مجید کے اس فیصلہ کے بعد یہ سوال وہاں کے مسلمانوں میں بحث کا موضوع کیسے بن رہا ہے؛ وہاں کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اسے تسلیم کرنے کے بعد، کہ قرآن کی رُو سے مسلمان لڑکی کی شادی غیر مسلم کے ساتھ جائز نہیں، سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس مشکل کا کوئی دوسرا حل تلاش کریں۔

ملہ ہم اس وقت قرآن حکیم کے اس حکم کے مصالح کے متعلق گفتگو نہیں کر رہے کیونکہ یہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔

بقیہ:- حقائق و عبر- (ص۲۳ سے آگے)

کتنا بڑا دھوکہ ہے جو قوم کو دیا جا رہا ہے!

یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ مودودی صاحب "اسلام کا نام لے کر کام کرنے والوں سے نزاع نہیں چاہتے" لیکن طلوعِ اسلام کی مخالفت اپنی زندگی کا مشن سمجھتے ہیں۔ اور اس کے خلاف سب سے بڑا بہتان یہی تراشتے ہیں کہ یہ اسلام کا نام لے کر غیر اسلامی نظریات پھیلا رہا ہے۔ یہ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ طلوعِ اسلام اس قسم کی مفاہمت (یعنی منافقت) کے لئے کبھی تیار نہیں ہوگا۔ وہ ہر نقلی مال بیچنے والے کی ملمع سازی کو بے نقاب کرتا رہے گا۔ اور اس میں سرِفہرست خود جماعتِ اسلامی ہے۔

بقیہ:- نقد و نظر... (ص۵۱ سے آگے)

لکھتے ہیں:-

> فقہاء کے تذکروں کی ورق گردانی کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر فقہاء اپنے پیشے کی نسبت سے معروف ہوئے، امام جصاص اپنے پیشے گچ کاری کی طرف منسوب ہیں۔ پیتل کے برتن بیچنے والے (صفار) عطر فروش (صیدلانی) حلوہ فروش (حلوائی) آٹا بیچنے والے (دقاق) صابون فروش (صابونی) جوتا بنانے والے (نعالی) سبزی فروش (بقالی) اور کرابیسی یعنی معمولی کپڑوں کی تجارت کرنے والوں کے نام دکھائی دیتے ہیں۔ (صفحہ ۱۹۳)

ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارے مولوی حضرات بندگانِ دین کے اس اُسوہ کی تقلید بھی کر لیتے اور خدمتِ دین اور مساجد کی امامت کو تنخواہ دار پیشہ میں تبدیل نہ کرتے تو ہمارے ہاں اتنے فرقے جنم نہ لیتے۔ یا کم از کم ان میں اتنا تشدد نہ پایا جاتا کہ اگر مخالف فرقے کا کوئی شخص دوسرے فرقے کی مسجد میں نماز پڑھ جائے تو اُسے پاک کرنے کے لئے دھونا پڑ جائے۔

جیسا کہ راقم اشارہ کر چکا ہے، یہ معاملہ ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ جس نظام کو روشن خیال مصلحین امت بالاتفاق مردہ قرار دے چکے ہیں، اسے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے کیا مقاصد ہیں۔ خود مصنف جو اچھے لکھے پڑھے آدمی معلوم ہوتے ہیں، اگر اپنی یہی توانائی کسی ایسے مسئلے کی تحقیق پر صرف کرتے، جس سے اُمتِ مسلمہ کی کوئی مشکل حل ہو سکتی۔ تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

(رفیع اللہ شہاب)

اصلی- کانپوری- لیتھو کتابت کی سیاہی

ہمارے پاس برائے فروخت موجود ہے۔
ضرورت مند حضرات رابطہ قائم کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام گلبرگ ۲ لاہور